علم و ادب کے میدان میں ہمدرد کی نہایت پُرخلوص خدمت

آخری لمحے

اسرار و سراغ کی ایک دِل چسپ کہانی

رفیع الزماں زبیری

نونہال ادب

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

آخری لمحے

ناشر	:	ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ہمدرد سینٹر ناظم آباد ۳
طابع	:	فضلی سنز
اشاعت	:	پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۳
تعدادِ اشاعت	:	۲۰۰۰
قیمت	:	[illegible]/ روپے

نونہال ادب کی کتابیں "نہ نفع، نہ نقصان" کی بنیاد پر شائع کی جاتی ہیں۔
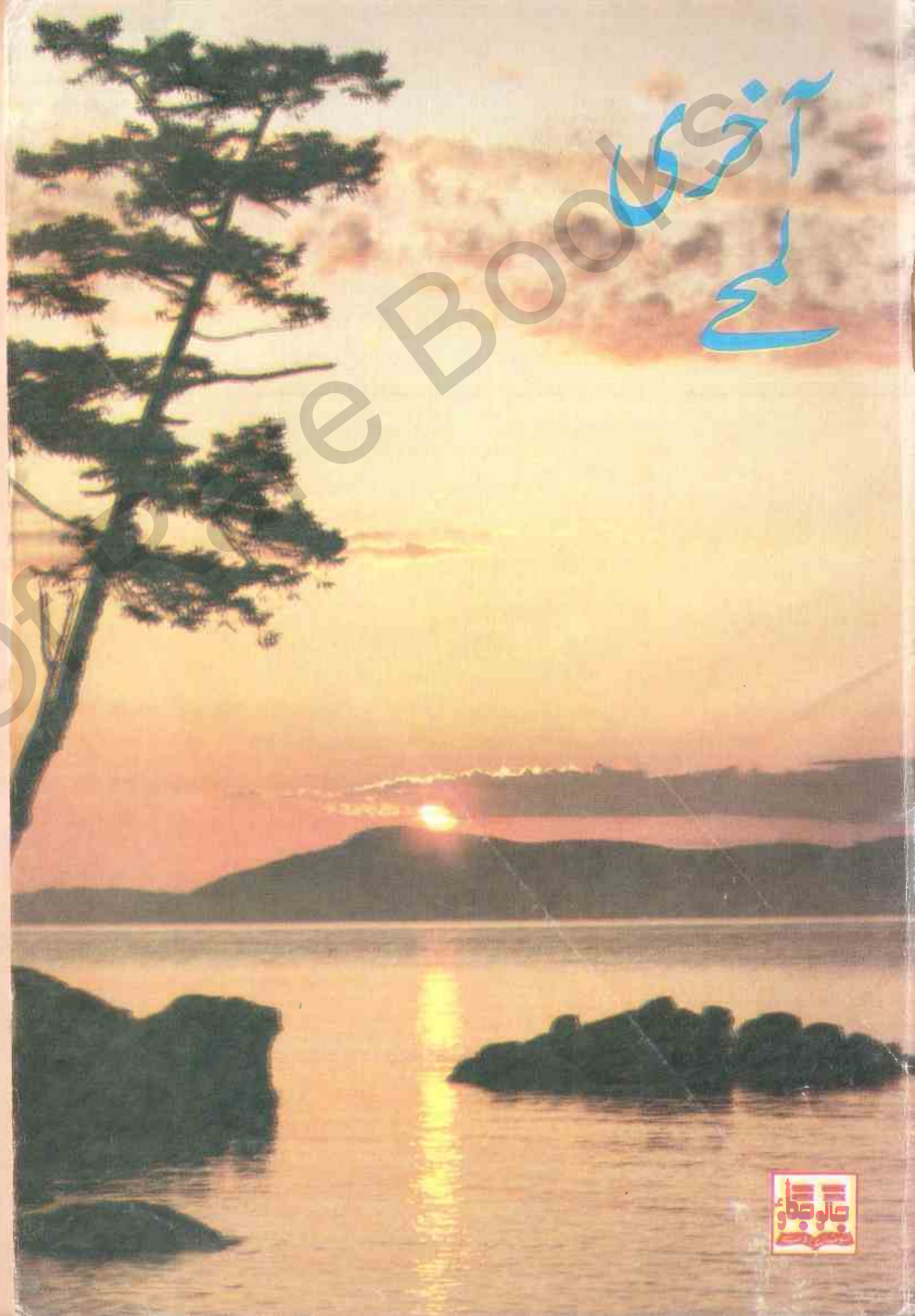
پیش لفظ

جس طرح ساری دنیا کا اندھیرا بھی ایک چھوٹے سے چراغ کی روشنی کو مٹا نہیں سکتا۔ اسی طرح ایک اچھی کتاب کے سامنے جہالت کے اندھیرے نہیں ٹھیر سکتے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کتاب اور علم کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ علم آدمی کو انسان بناتا ہے۔ اشرف بناتا ہے، برے اور بھلے کی تمیز سکھاتا ہے اور کتاب ذہن کو جِلا بخشتی ہے۔ کتاب ذہن کو روشن کرتی ہے!

کتاب ایک اچھی ساتھی ہے، کتاب ایک سچّا دوست ہے۔ اچھا دوست وہی ہوتا ہے جو دوست کا بھلا چاہتا ہے۔ دوست یہ چاہتا ہے کہ ہم صاحبِ کردار ہوں، ہم میں امانت ہو، دیانت ہو، صداقت ہو۔ ہمارے اخلاق ایسے اچھے ہوں کہ سب ہمیں پسند کریں۔ ہماری ذات سے کسی کو دکھ نہ پہنچے۔ اچھی کتاب ہمیں ایسا ہی اچھا انسان بننا سکھاتی ہے۔

جس طرح دنیا میں اچھے اور بُرے لوگ ہیں، اسی طرح کتابیں بھی اچھی اور بُری ہوتی ہیں۔ اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بُروں کے پاس بیٹھ کر تو آدمی بُری باتیں ہی سیکھتا ہے۔ تمھیں ہمیشہ اچھی کتابیں تلاش کر کے پڑھنی چاہییں تا کہ تم اچھے بنو۔

حکیم محمد سعید

فہرست

آخری لمحے

کوٹ لکھپت جیل لاہور میں پھانسی کی سزا پانے والے مجرموں کی کوٹھری میں بہادر، اکیلا اور اداس بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانا سا رسالہ تھا۔ بظاہر وہ رسالہ پڑھ رہا تھا، لیکن اصل میں وہ صرف تصویروں کو گھور رہا تھا اور اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ باہر راہ داری میں قدموں کی آواز سنائی دی جو اس کی کوٹھری کے دروازے کے باہر آکر رُک گئی۔ تالے میں چابی گھومی اور لوہے کا بھاری دروازہ کھُل گیا۔ ایک لمحہ کے لیے تو دروازے میں کھڑے لمبے قد کے اسمارٹ آدمی کو بہادر پہچان ہی نہیں سکا پھر خوشی سے اُچھل پڑا۔

"انسپکٹر جمیل!" وہ خوشی سے چیخا۔

انسپکٹر جمیل احمد کوٹھری میں داخل ہُوا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت تھی۔

"آپ واقعی آگئے؟" بہادر کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

"جب کسی پھانسی کے مُجرم سے اُس کی آخری خواہش پوچھی جائے اور وہ مجھ سے مِلنے کی خواہش کرے تو ظاہر ہے مجھے تشویش ہونی چاہیئے۔"

بہادر نے آگے بڑھ کر انسپکٹر کا بازو پکڑ لیا۔ "انسپکٹر میں بے قصور ہوں ..... یقین کریں ..... میں قسم کھاتا ہوں ..... میری مدد کریں ..... اللہ کے لیے ......"

"میں اور تم پر یقین کروں؟" انسپکٹر جمیل نے بہادر کو چُبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا "تین دفعہ تو میں خود تم کو جیل بھیج چکا ہوں۔"

"اسی لیے آپ مجھ پر یقین کریں ... کیوں کہ آپ نے جب بھی مجھے پکڑا کبھی میں نے آپ سے یہ التجا کی کہ مجھے چھوڑ دیں، میں بے قصور ہوں؟"

انسپکٹر جمیل نے نفی میں گردن ہلائی۔

"لیکن اب میں یہ کہہ رہا ہوں .... کیوں کہ میں بے قصور ہوں ..... ٹھیک ہے میں ایک مجرم ہوں .... آپ کو میرا رِکارڈ معلوم ہے۔ دھوکا دہی، جعل سازی اور لوٹ مار جیسے چھوٹے چھوٹے جرائم ... میں مانتا ہوں کہ میں نے ایسے چھوٹے جرائم کیے ہیں، لیکن اس سے زیادہ نہیں ..... میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی پر تشدد نہیں کیا ... دنگا فساد نہیں کیا۔"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو!" انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس سے پہلے کبھی قتل نہیں کیا تھا۔"

"میں نے قتل نہیں کیا ہے .... یقین کریں ..... میں قسم کھاتا ہوں میں بے قصور ہوں ..... انسپکٹر اللہ کے لیے میری مدد کریں!" بہادر نے پھر التجا کی۔

"تم نے اس سے پہلے مجھ سے مدد کیوں نہیں مانگی؟" انسپکٹر نے اس کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ میرا خیال تھا کہ کسی بے قصور انسان کو کسی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں بغیر مدد کے ہی رہا ہو جاؤں گا۔ لیکن اب میری آخری اپیل بھی رد ہو چکی ہے اور مجھے پھانسی کی سزا ہو گئی ہے۔" بہادر نے افسردگی سے کہا۔

انسپکٹر تیز نظروں سے بہادر کو دیکھتا رہا جیسے اس کے اندر جھانک رہا ہو۔ اس کی نظروں کی تاب کوئی مجرم مشکل ہی سے لا سکتا تھا، لیکن بہادر اطمینان سے بیٹھا انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔ پھر وہ بغیر کچھ کہے اُٹھا اور کوٹھری سے باہر نِکل گیا۔ بہادر خالی خالی نظروں سے دروازے کو گھورتا رہا۔

راہ داری میں جیلر کھڑا انسپکٹر جمیل کا انتظار کر رہا تھا۔ "کیا ہُوا؟" جیلر نے انسپکٹر کے سنجیدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا اور انسپکٹر کو اپنے آفس کی طرف لے کر چلا۔

"پھانسی کب ہے؟" انسپکٹر نے جیلر کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔
"جمعرات کی صبح چھے بجے۔" جیلر نے جواب دیا۔
"جمعرات کو؟" انسپکٹر نے پریشانی سے پوچھا۔ "آج پیر ہے اس کا مطلب یہ ہُوا کہ میرے پاس تین دن سے بھی کم وقت ہے..."
"کس کے لیے؟" جیلر نے حیرانی سے پوچھا۔
"بہادر کو رہا کرانے کے لیے۔" انسپکٹر نے کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

۲

انسپکٹر جمیل احمد کے آفس میں ایک میز کے گرد چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک خود انسپکٹر جمیل احمد، دوسرا اس کا اسسٹنٹ الیاس فرید، تیسرے انسپکٹر ہمایوں مرزا اور چوتھا شخص وکیل، میاں حبیب نواز، جس نے مقدمے میں بہادر کی پیروی کی تھی۔ سب کے سامنے میز پر کاغذات کی فائلیں تھیں۔

الیاس فرید نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل بند کرتے ہوئے کہا، "جناب! میرے خیال میں آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

انسپکٹر جمیل نے الیاس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے انسپکٹر ہمایوں مرزا سے پوچھا، "ہمایوں! "یہ کیس تمھارے پاس تھا، تمھارا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال میں میں نے اتنا آسان کیس اس سے پہلے کبھی زندگی میں نہیں کیا ہو گا۔" انسپکٹر ہمایوں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے کہ تمھیں ذرا سا شبہ بھی نہیں ہُوا کہ ہو سکتا ہے بہادر بےقصور ہو؟" انسپکٹر جمیل نے انسپکٹر ہمایوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

انسپکٹر ہمایوں کھڑا ہو گیا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھنے لگا، پھر آہستہ سے بولا، "تم خود دیکھ لو ساری حقیقت سامنے ہے۔ دو مجرم ساتھ مل کر کراچی میں ایک واردات کرتے ہیں۔ ایک بہادر اور دوسرا مقتول جمشید۔ بہادر پکڑا گیا اور جیل چلا گیا۔ جب کہ جمشید واردات سے حاصل کی ہوئی رقم لے کر یہاں لاہور بھاگ آیا، اور اپنی بیوی بچّوں کے ساتھ یہاں اچھی خاصی زندگی گزارنے لگا۔ جب بہادر آزاد ہُوا تو جمشید سے اپنا حصّہ لینے کے لیے سیدھا اس کے گھر یہاں لاہور پہنچا۔"
انسپکٹر ہمایوں اپنی سگرٹ جلانے کے لیے کچھ دیر رُکا۔ اگلے دن... جمشید کی لاش

ملی.... اس کی موت سر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ قریب ہی لوہے کی وہ سلاخ ملی جس سے چوٹ لگائی گئی تھی۔ اس سلاخ پر بہادر کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ اس کمرے میں رکھی جمشید کی الماری کی دراز ٹوٹی ہوئی تھی۔ جس میں سے رُوپے غائب تھے۔ ہم نے بہادر کی تلاشی لی تو وہ رُوپے مل گئے اور یہ بھی ثابت کر لیا گیا کہ یہ رُوپے ایک دن پہلے جمشید کے پاس تھے۔

دیکھا سر! الیاس بیچ میں بول اُٹھا "سب ثبوت مل گئے۔ انگلیوں کے نشانات.... چرائی ہوئی رقم اور.... قتل کی وجہ۔"

انسپکٹر جمیل نے الیاس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور مسلسل انسپکٹر ہمایوں کو گھورتے ہوئے پوچھا، "تم نے اب تک مجھے اپنی رائے نہیں بتائی.... ثبوت تو ٹھیک ہیں لیکن تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میں نے صرف ثبوت جمع کیے تھے۔ باقی تو قانون کے ہاتھ میں تھا کہ وہ کیا کہتا ہے؟ اور اس کیس میں قانون نے بہادر کو مجرم ٹھیرایا ہے کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"لیکن پھر بھی تمہیں خود پورا یقین نہیں ہے۔ ہیں نا؟"

"اف جمیل! بعض دفعہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم انسان کے دِل کے اندر جھانک لیتے ہو.... چلو میں مان لیتا ہوں۔ تم ٹھیک سمجھے۔ مجھے واقعی شک ہے کیوں بہادر بہرحال ایک عقل مند آدمی ہے، جرائم ہمیشہ ہوشیاری سے کرتا ہے، اور یہ قتل بالکل اناڑیوں کی طرح کیا گیا ہے۔ قاتل سارے ثبوت ایسے ہی چھوڑ گیا جیسے وہ بے وقوف ہو۔ ذرا سی بھی سوجھ بوجھ والا آدمی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ بہادر بُرا آدمی سہی، لیکن وہ بے وقوف آدمی نہیں ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"لیکن ہم ثبوت اور واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔" الیاس نے کہا۔ وکیل صاحب جو بڑی دیر سے خاموشی سے سب کچھ سُن رہے تھے، بول اُٹھے۔ "حضرات! جب کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں بہادر کا وکیل تھا۔ میرا خیال ہے کہ بہادر.... واقعی مجرم ہے۔" وکیل صاحب نے کچھ دیر رُک کر سب کے چہروں پر اپنے الفاظوں کا تاثر دیکھا پھر اپنی بات جاری رکھتے

ہوئے بولے۔ "آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ بہادر کا بیان اس سلسلے میں کیا تھا؟..... اس کے کہنے کے مطابق وہ دو مرتبہ جمشید کے گھر گیا۔ پہلی مرتبہ چھ بجے!.... وہ کہتا ہے کہ جمشید گھر پر نہیں تھا اس کی بیوی نے اس کو اندر بلایا اور ایک چھوٹے کمرے میں بِٹھایا۔ سردیوں کے دن تھے، انگیٹھی میں کوئلے دھک رہے تھے۔ قریب ہی لوہے کی ایک سلاخ پڑی تھی۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے جمشید کا انتظار کرتا رہا اس دوران وہ سلاخ سے انگیٹھی کے کوئلوں کو ٹھیک کرتا رہا۔ اس لیے سلاخ پر بہادر کی انگلیوں کے نشانات آ گئے اور وہ سلاخ آلۂ قتل کے طور پر عدالت میں پیش ہوئی۔ جب ایک گھنٹے تک جمشید نہیں آیا تو بہادر واپس آ گیا، اور نو بجے کے قریب دوبارہ گیا تو جمشید کی بیوی نے اس کو بتایا کہ اس کا شوہر بہادر کے جانے کے بعد گھر آ گیا تھا، لیکن اب پھر کہیں چلا گیا ہے۔" وکیل صاحب طنزیہ مسکرائے۔

"بہادر یہاں لاہور میں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھیرا ہُوا تھا۔ جمشید کی بیوی کو وہ اپنا پتا بتا آیا تھا۔ اگلی صبح ایک آدمی رُپوں سے بھرا ہُوا ایک لفافہ بہادر کو اس کے ہوٹل میں دے گیا کہ یہ جمشید نے اس کو بھیجے ہیں..... بہادر کی کہانی بڑی کمزور ہے اور بس یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آگے بھی سُنیے! ..... جیسا کہ ہم سب کو پتا ہے کہ جمشید کی موت تقریباً آٹھ بجے واقع ہوئی۔ اس وقت بہادر کہاں تھا؟" وکیل صاحب نے سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا ٹیلے فون کی گھنٹی بجی اور انسپکٹر جمیل نے فون اُٹھایا سب لوگ خاموش ہو گئے۔

"جی! انسپکٹر جمیل احمد بول رہا ہوں ... جی سر... میرے خیال میں بہادر کے کیس میں دوبارہ تفتیش کرنا پڑے گا .... جی میرے خیال میں جیلر صاحب نے آپ سے ذکر کیا ہو گا؟.... جی سر.... جی!" اچانک انسپکٹر کے چہرے پر مزید سنجیدگی آ گئی، کچھ دیر وہ خاموشی سے سُنتا رہا اور پھر فیصلہ کن لہجہ میں کہا، "جی سر .... میں سمجھتا ہوں .... اگر میرا اندازہ غلط نِکلا تو.... تو میں استعفیٰ دے دوں گا!"

الیاس نے چونک کر اپنے افسر کو دیکھا اس نے اپنی زندگی میں کبھی جمیل کو اتنا سنجیدہ اور پُرعزم نہیں دیکھا تھا۔

"ہیڈ کواٹر سے فون تھا۔" انسپکٹر جمیل نے بتایا، "مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں بہادر کے کیس کو ہاتھ نہ لگاؤں۔۔۔ لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔"

انسپکٹر ہمایوں نے پریشانی سے انسپکٹر جمیل کو دیکھتے ہوئے کہا، "جمیل پاگل مت بنو! تمھارے مستقبل کا سوال ہے۔"

"لیکن یہاں ایک انسان کی زندگی کا سوال ہے۔" جمیل نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور تمھارا اپنا خیال ہے کہ وہ بے قصور ہے۔۔۔۔ میرے خیال میں تم غلطی کر رہے ہو۔" وکیل صاحب نے بھی سمجھانے کی کوشش کی۔ "اس کیس میں بہادر کی ایک ایسی شہادت ہے جو اس مقدمے میں سامنے نہیں لائی گئی۔۔۔۔ اور اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بہادر واقعی مجرم ہے۔"

ایک لمحے کے لیے جمیل کا دماغ گھوم گیا۔ اگر واقعی وکیل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں تو پھر جمیل بے کار اپنا پورا مستقبل داؤ پر لگا رہا ہے۔

"بہادر کے گرفتار ہونے کے فوراً بعد جب میں نے اس سے بیان لیا۔" وکیل صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "تو اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے پاس ایک ایسا گواہ ہے جو یہ ثابت کر سکتا ہے کہ جمشید کے قتل کے وقت یعنی تقریباً سات بجے سے نو بجے تک وہ واردات کی جگہ پر موجود نہیں تھا بلکہ اس گواہ سے ایک پارک میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اور پتا ہے بہادر کس سے باتیں کر رہا تھا؟۔۔۔ قریبی پارک میں ایک بینچ پر بیٹھا ایک مولوی صاحب سے!"

"مولوی صاحب؟" جمیل نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں! مولوی صاحب اور ان کا حُلیہ جو بہادر نے مجھے بتایا ویسا حُلیہ کسی مولوی کا کا ہونا بالکل ناممکن نظر آتا ہے بہادر کے کہنے کے مطابق مولوی صاحب کے سر اور ڈاڑھی کے بالوں کا رنگ سُرخ تھا، ناک کسی پرانی چوٹ کی وجہ سے ٹیڑھی تھی اور سب سے مزے کی بات یہ کہ وہ مولوی صاحب بہادر کو تاش کے پتّوں کے کرتب سکھا رہے تھے۔"

"مولوی صاحب اور تاش کے پتّے، واہ کیا کہانی ہے، کمزور اور مضحکہ خیز، لیکن یہ

ناممکن تو نہیں ہے،" انسپکٹر جمیل نے کہا۔

"سُرخ ڈاڑھی؟" وکیل صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیوں کیا ہمارے یہاں بعض مولوی صاحبان سر اور ڈاڑھی پر مہندی نہیں لگاتے؟" انسپکٹر نے اُلٹا ان سے سوال کر دیا۔

"اور تاش کے کھیل؟۔۔۔ لیکن صرف یہی نہیں!" وکیل صاحب نے مزید کہا، "بہادر کے کہنے کے مطابق وہ مولوی صاحب لاہور اسٹیشن سے ریل گاڑی سے ملتان کے قریب ایک دیہات سلام آباد جا رہے تھے۔ جہاں سے ان کو ملتان کے مزار کے عرس میں شریک ہونے ملتان جانا تھا۔ لاہور سے جانے والی کوئی گاڑی سلام آباد کے اسٹیشن پر نہیں رُکتی۔ ہو سکتا ہے وہ قریبی اسٹیشن پر اُتر کر سلام آباد چلے گئے ہوں۔ لیکن میں نے اچھی طرح معلوم کر لیا ہے کہ سلام آباد کے قریبی اسٹیشنوں میں سے کسی پر بھی اس حلیہ کا کوئی آدمی نہیں دیکھا گیا۔ نہ صرف وہاں بلکہ ملتان اور خاص طور پر وہاں عرس میں شریک تمام لوگوں کو دیکھا گیا۔ اس حلیہ کا کوئی بھی آدمی وہاں کسی نے بھی نہیں دیکھا اس کا مطلب یہ ہُوا کہ بہادر کا کوئی گواہ ہے ہی نہیں، یہ سب کچھ من گھڑت کہانی تھی اور وہ بھی بے وقوفی سے بنائی ہوئی کہانی۔ اس لیے میں نے بہادر کو منع کر دیا کہ اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرے۔

وکیل صاحب نے اپنی بات ختم کی۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے چاروں افراد خاموش تھے۔ وکیل صاحب نے اپنے کاغذات سمیٹے، بریف کیس میں رکھے اور کرسی پیچھے دھکیل کر کھڑے ہو گئے۔ کمرے میں اسی طرح خاموشی رہی اور وکیل صاحب سب کو اللہ حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ آخر الیاس نے خاموشی کو توڑا۔

"اب تو سب کچھ طے ہو گیا نا؟"

"ہاں جو کچھ وکیل صاحب نے بتایا۔ اس کے بعد تو بات طے ہی لگتی ہے۔" انسپکٹر جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

الیاس نے چونک کر انسپکٹر جمیل کو دیکھا۔ جمیل اب بھی یہ مہم سر کرنے پر تیار نظر آتا تھا۔ الیاس نے ٹھنڈی سانس لی اور ہار مانتے ہوئے کہا۔ "او۔ کے۔ سر! جیسے آپ

کہیں۔ پھر کیا کسی جاسوسی ادارے سے مدد لیں۔ آخر ہم کہاں سے شروع کریں؟"

"ہم ؟" انسپکٹر جمیل نے "ہم" پر زور دیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"کیا آپ کا خیال ہے کہ اگر ہیڈ کوارٹر آپ کو نوکری سے نکال دے گا تو کیا میں یہاں رہنا پسند کروں گا ؟ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"شکریہ الیاس، میں ہمیشہ یہ بات یاد رکھوں گا۔" جمیل نے کہا۔

"لیکن سر! کیا اب یہ ثابت نہیں ہو گیا ہے کہ بہادر مجرم ہے ؟" الیاس نے آخری کوشش کی۔

"نہیں ! بلکہ اب ہمیں یہ یقین ہو جانا چاہیئے کہ وہ بے گناہ ہے۔" جمیل نے کہا۔

الیاس اور انسپکٹر ہمایوں حیرانی سے اس کی شکل دیکھنے لگے۔ "تمھیں پتا ہے کہ بہادر ایک جرائم پیشہ آدمی ہے۔ اس نے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے جرم کیے ہیں لیکن قتل کبھی نہیں کیا اور نہ ہی کبھی قتل کرنے کے شبہ میں گرفتار ہوا ہے۔ اور وہ بے وقوف بھی نہیں ہے۔ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے اور جرم ہمیشہ ہوشیاری سے کرتا ہے۔ اسی لیے اس کو سزا بھی ہمیشہ کم ہی ملی ہے۔ لیکن اس قتل کی واردات میں لگتا ہے کہ قاتل نہایت ہی احمق انسان ہے۔ جو سارے ثبوت بڑی بے وقوفی سے چھوڑ گیا اور پھر گواہ کے لیے اتنی کم زور کہانی بنائی۔ اگر بہادر قتل کرتا تو وہ کوئی ثبوت نہ چھوڑتا اور نہ ہی ایسی کہانی بناتا۔ اس کہانی کا مطلب ہے کہ یہ سچ ہے، ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا۔ سارے ثبوت آسانی سے مل جاتے سے یہ لگتا ہے کہ کسی نے بہادر کو پھنسانے کے لیے ثبوت جان بوجھ کر یہاں چھوڑے ہیں۔"

"سر! لگتا ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایسا ہی ہوا ہوگا۔" الیاس بولا۔

"اللہ کرے کہ یہ سچ ہو۔ ورنہ مجھے زندگی میں دوسرا موقع نہیں ملے گا۔ کم از کم انسپکٹر کی حیثیت سے نہیں۔" جمیل نے کہا۔ "وقت بہت کم ہے ہمیں فوراً کام شروع کر دینا چاہیئے۔"

"سب سے پہلے کیا کرو گے ؟" انسپکٹر ہمایوں نے پوچھا۔

"ملتان جانا ہوگا۔" جمیل نے کہا۔ "ملتان اور سلام آباد جہاں ایک مولوی صاحب

ہیں جو یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ بہادر بے گناہ ہے۔"

"میں آپ کے لیے جہاز کی سیٹ بک کرواتا ہوں۔" الیاس نے کہا۔ "شکریہ الیاس ! ملتان پولس کو بھی فون کر دو کہ میں آرہا ہوں اور ان کی مدد کا شکر گزار ہوں گا۔ ان کو کیس کے بارے میں بتا دو اور کہو کہ قریبی قصبوں اور گاؤں میں جہاں بھی دینی مدرسے ہوں ان کی فہرست تیار کرلیں۔ خاص طور پر ملتان اور سلام آباد کی۔"

الیاس فون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ انسپکٹر ہمایوں نے گھڑی دیکھتے ہوئے انسپکٹر جمیل سے کہا۔ "پانچ بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ جب تم ملتان پہنچو گے رات ہو چکی ہو گی تم کل صبح تک کچھ نہیں کر سکتے، اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمھارے پاس صرف دو دن رہ جاتے ہیں صرف دو دن، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بہادر بے گناہ ہے یہ سب کتنا مشکل ہے جمیل ! میرے خیال میں تم ایک مرتبہ پھر سوچ لو اور یہ دردسری مول لینے کی بجائے ہیڈ کوارٹر فون کرکے معذرت کرلو شاید وہ لوگ ---"

"اور ایک بے گناہ آدمی کو مرنے دوں ؟ صرف اپنی نوکری بچانے کے لیے ؟ --- دُنیا کی کسی نوکری کی قیمت ایک انسانی جان نہیں ہو سکتی۔" جمیل نے غصّے سے کہا

"معاف کرنا جمیل !" انسپکٹر ہمایوں نے کہا، "مجھے ایسے وقت تمھیں کم ہمت نہیں کرنا چاہیئے۔"

"کوئی بات نہیں ہمایوں ! تم میرے دوست ہو اور میری بھلائی چاہتے ہو۔" انسپکٹر جمیل نے کہا اور پھر الیاس سے مخاطب ہو کر کہا، "میں تم کو ملتان سے فون کر کے حالات سے آگاہ کرتا رہوں گا۔"

۳

لیکن چوبیس گھنٹے بعد جب جمیل نے ملتان سے فون کیا تو نتیجہ نہایت مایوس کُن تھا۔ جلال نے اپنے اسسٹنٹ کو بتایا کہ بہادر کے بتائے ہوئے حلیے کا کوئی مولوی نہ سلام آباد میں ملا اور نہ ہی ملتان اور اس کے نواحی علاقوں میں۔ ملتان پولس نے اپنا دائرہ مزید بڑھا دیا ہے۔ اب میرے یہاں رُکنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی تلاش جاری رکھیں گے۔ میں اگلی فلائٹ سے لاہور واپس آ رہا ہوں۔ اب ہمارا اگلا قدم جمشید کی بیوہ سے ملاقات ہوگا۔ شاید اس سے کوئی سراغ ہاتھ لگ جائے۔ انسپکٹر جمیل نے کہا اور فون بند کر دیا۔ الیاس نے سوچا کہ اگر جمیل فوراً بھی واپس آ جائے تو کل صبح سے پہلے جمشید کی بیوہ سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس کا مطلب یہ ہُوا کہ جمیل کے پاس صرف ایک دن رہ جائے گا۔

اگلے دن جمیل ایر پورٹ سے سیدھا جمشید کے گھر روانہ ہوگیا۔ بغیر آرام اور خوراک کے مسلسل کام کی وجہ سے اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تھکن سے اس کی بُری حالت ہو جاتی۔ لیکن جمیل ایسے کام کرنے کا عادی تھا اور بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ جمشید کے گھر پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ اس کی دستک کے جواب میں ایک جوان مرد باہر آیا جس نے بتایا کہ وہ شہزاد رضا ہے۔ انسپکٹر جمیل نے اپنا تعارف کرایا تو شہزاد کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے منھ بناتے ہوئے کہا کہ میں مسز جمشید کا قریبی عزیز ہوں۔ انسپکٹر صاحب میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں کہ ان سے کوئی ایسی بات نہیں کیجیے گا جس سے ان کے دماغ یا دل پر دباؤ پڑے کیوں کہ وہ اب تک اپنے شوہر کے حادثے کا صدمہ برداشت نہیں کر پائی ہیں۔ اور شدید بیمار ہیں کوئی بھی صدمہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔

جمیل نے اثبات میں سر ہلایا اور شہزاد کے ساتھ اندر چلا گیا۔

مسز جمشید اور جمیل کی گفت گو کے دوران شہزاد موجود رہا اور مسز جمشید کو تسلی دیتا رہا۔ حال آں کہ انسپکٹر جمیل کے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا، لیکن پھر بھی اس نے شہزاد کی ہدایت کے مطابق مسز جمشید سے نہایت نرمی سے بات کی۔ مسز جمشید نے بتایا کہ جیسے ہی بہادر اس کے گھر سے باہر گیا اور وہ کمرے میں داخل ہوئی اس نے اپنے شوہر مُردہ حالت میں پایا۔ اس وقت تقریباً چھے بج رہے تھے۔ اپنے شوہر کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بے ہوش ہوگئی۔ جب انھیں ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی۔ انھوں نے فوراً پولس کو بلایا۔

انسپکٹر جمیل نے اُن سے پوچھا کہ انھوں نے مقدمے کے دوران کوئی شہادت کیوں نہیں دی۔ اس سے پہلے کہ مسز جمشید کوئی جواب دیتی شہزاد بیچ میں بول اُٹھا۔ انسپکٹر صاحب آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ مسز جمشید اس صدمے کو اب تک بھلا نہیں سکی ہیں۔ جب سے ان کے شوہر کا قتل ہوا ہے یہ بستر سے لگ گئی ہیں۔ اور پھر مقدمہ اتنا سیدھا تھا کہ اس میں ان کی گواہی کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

مسز جمشید نے بڑی مشکل سے اپنے حواس بحال کیے اور تکیہ کے سہارے سے بیٹھتی ہوئی نحیف آواز میں بولی، "انسپکٹر صاحب! اب جب کہ مقدمہ کا فیصلہ ہو چکا ہے آپ اب یہ سارے سوالات مجھ سے کیوں کر رہے ہیں؟"

"اس لیے!" جمیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا، "کیوں کہ مجھے اب یہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ بہادر بے گناہ ہے۔"

مسز جمشید کو جمیل سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔ اس کو دھچکا سا لگا۔ اس کا سر تکیہ سے نیچے گرنے لگا۔ اگر شہزاد بڑھ کر اس کو سنبھال نہ لیتا تو وہ ضرور بستر سے نیچے گر جاتی۔ شہزاد پریشان نظر آنے لگا تو مسز جمشید نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ کچھ دیر چُپ رہی جیسے اپنے آپ کو سنبھال رہی ہو پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمھارا یہ خیال کہ وہ بے گناہ ہے۔ بالکل غلط ہے۔"

"معاف کیجیے گا محترمہ! لیکن آپ یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"کیوں کہ" مسز جمشید رک گئی شاید وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ بات بتلائے یا نہ بتائے۔ آخر اس نے کہا۔ "کیوں کہ ... میں نے اپنی آنکھوں سے بہادر کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

انسپکٹر جمیل جس کو بہادر کے بے گناہ ہونے کا یقین ہو چلا تھا، اس انکشاف سے بھونچکا رہ گیا اور اس کا یقین متزلزل ہونے لگا۔

۴

اپنے آفس میں واپس آکر وہ پھر الیاس اور انسپکٹر ہمایوں سے بحث کرنے لگا۔ ہر چھوٹے بڑے پوائنٹ پر غور کیا گیا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ "پتا نہیں ہم کہاں غلطی کر رہے ہیں؟" جمیل نے کہا، "مجھے یقین ہے کہ بہادر بے قصور ہے، لیکن کوئی نہ کوئی ایسا نقطہ ضرور ہے جس تک ہم ابھی تک پہنچ نہیں پائے ہیں۔"

"گیارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔" ہمایوں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا، "اور اب تمھارے پاس اُنیس گھنٹوں سے بھی کم وقت رہ گیا ہے۔"

"ہاں پھانسی کل صبح چھے بجے ہے۔" الیاس نے کہا۔

"اگر ہم کو ثبوت مل جائے تو پھر پانچ منٹ بھی بہادر کو بچانے کے لیے بہت کافی ہیں۔" جمیل نے میز پر مُکّا مارتے ہوئے کہا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور کمرے میں بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ اس کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں اور وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کبھی وہ مُکّا ہوا میں لہراتا اور کبھی میز پر مارتا۔ "اوہ، وہ کون سی بات ہے جو ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ بہادر بے گناہ ہے، لیکن ہم اس ثبوت تک کیوں نہیں پہنچ پا رہے ہیں، وہ ثبوت... کاش مجھے وہ ثبوت مل جاتے! کاش مجھے معلوم ہو جاتے کہ ہم کہاں غلطی کر گئے ہیں، کاش..."

"دیکھو جمیل!" انسپکٹر ہمایوں نے کہا، "تم مسلسل اڑتالیس گھنٹوں سے کام کر رہے ہو اور بہت زیادہ تھک گئے ہو، کیوں نا تھوڑا سا وقفہ کر لیں؟ صرف پندرہ منٹ کے لیے! آؤ اس کیس کو بھول جاتے ہیں اور باہر چل کر اچھی سی چائے پیتے ہیں، صرف تھوڑی دیر کے لیے، پندرہ منٹ میں تم پھر تر و تازہ ہو جاؤ گے اور ہو سکتا ہے کہ تمھارا دماغ زیادہ اچھی طرح کام کرنے لگے۔ کیا خیال ہے؟"

جمیل نے نفی میں گردن ہلائی، لیکن الیاس نے جمیل کی ٹوپی اور کوٹ اٹھا لیا۔ "انسپکٹر ہمایوں ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! پندرہ منٹ میں کوئی نقصان نہیں ہو گا اور ہو سکتا ہے تازہ دم ہو کر ہم کسی اچھے نتیجے پر پہنچ سکیں، آئیں چلیں یہ بھی کر کے دیکھ لیں۔" الیاس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جمیل نے دونوں کو اس طرح دیکھا جیسے وہ بالکل اس کے لیے تیار نہ ہو۔ پھر اس کے ہونٹوں پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ آگئی۔ "ٹھیک ہے! تم دو ہو، میں اکیلا۔ تم جیت گئے۔"

تھانے سے پچاس گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ریستوراں تھا۔ تینوں وہاں جا کر چائے پینے لگے۔ اس دوران بھی اپنے ساتھیوں کی خواہش کے باوجود جمیل اپنے ذہن سے اس کیس کو نہیں نکال سکا اور مسلسل سوچتا رہا۔

"چلو اب تک ہمیں ایک نیا پوائنٹ تو ملا۔" جمیل نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" اس کے دونوں ساتھیوں نے پوچھا۔

"مسز جمشید نے کہا ہے کہ اس نے بہادر کو اپنی آنکھوں سے قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ بہادر بے قصور ہے اور میرے خیال میں وہ بے گناہ ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسز جمشید جھوٹ بول رہی ہے، کیوں؟ اس لیے کہ وہ بھی اس قتل میں شریک ہے۔"

"آپ کے خیال میں ہم اس سے سچ اگلوا سکتے ہیں؟"

"نہیں اتنے کم وقت میں ہم ایسا نہیں کر سکتے۔" جمیل نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ہاں اگر ہمارے پاس کچھ ہفتے ہوتے یا پھر کچھ دن ہی ہوتے تو شاید ہم ایسا کر سکتے لیکن ہمارے پاس صرف چند گھنٹے ہیں اور اس میں ایسا کرنا ناممکن ہے۔"

جمیل کسی گہری سوچ میں تھا۔ اس کی بھنویں سکڑی ہوئی تھیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ وہ کسی بڑی الجھن میں تھا۔ کبھی اثبات میں گردن ہلاتا اور پھر نفی میں خود ہی اپنی سوچ کو جھٹک دیتا۔ اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے ساتھیوں سے ایک لفظ کہے بغیر ریستوران سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے باہر

آ گئے۔ تینوں خاموشی سے تھانے کی طرف چل دیے۔ وہ کچھ ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ دو لڑکوں نے جو اسکاؤٹ کی وردی پہنے ہوئے تھے ان کو روکا۔ "معاف کیجیے گا سر!" ان میں سے ایک لڑکے نے نہایت ادب سے کہا۔ اس کا لہجہ پنجابی تھا لیکن وہ بہت اچھی اردو بول رہا تھا۔ "آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ سلام آباد کے لیے ٹرین کس وقت جاتی ہے اور اسٹیشن کس طرف ہے۔"

جمیل نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا اور ان کو اسٹیشن کا راستہ بتایا اور ریل گاڑی کا وقت بھی بتایا۔

"چھٹیوں پر آئے ہوئے ہو؟" اس نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

جی جناب! لاہور گھومنے آئے تھے اب سلام آباد اور مری گھومنے کا۔"

"مری؟" جمیل نے حیرت سے پوچھا، "پھر تو میں نے تم کو غلط ٹرین کا وقت بتا دیا ہے۔ لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم سلام آباد جا رہے ہو؟"

"جی جناب میں نے آپ کو سلام آباد ہی کہا تھا جو مری کے قریب ہے۔" اب لڑکا جس نے پہلے سوال کیا تھا کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

جمیل غور سے دونوں لڑکوں کو دیکھنے لگا اب اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پھر جیسے وہ کسی نتیجہ پر پہنچ گیا۔

"جلدی کرو الیاس! ایک پنسل اور کاغذ دو۔" جمیل نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔ الیاس نے جیب سے قلم اور کاغذ نکال کر دے دیا۔ جمیل نے کاغذ پر دو نام لکھے۔ اسلام آباد اور سلام آباد۔ اور لڑکوں سے کہا۔

"دیکھو بچّو میں انسپکٹر جمیل ہوں۔ اب میں تم لوگوں سے جو سوال کروں گا وہ بہت اہم ہے بلکہ یوں سمجھو ایک کیس میں تمہاری مدد ہو گی۔ ذرا یہ دونوں نام مجھے پڑھ کر سناؤ۔ شاباش۔"

دونوں لڑکوں نے کاغذ پر لکھے ہوئے نام دہرائے، لیکن دونوں نے ناموں کو اپنے پنجابی لہجے میں سلام آباد ہی پڑھا۔

"اوہ بچّو!" جمیل نے اطمینان اور خوشی سے کہا، "آج تم دونوں نے میری جو

مدد کی ہے اس سے ایک انسانی جان بچ سکتی ہے۔ خوش رہو۔" اب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے آفس جانے کی بجائے آفس کے باہر اپنی گاڑی کی طرف چلا۔ دونوں لڑکے حیرانی سے ان کو گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

گاڑی میں جمیل کے ساتھیوں نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو روک دیا۔ "تھوڑا انتظار کرو پہلے میں بہادر سے بات کر لوں۔" لیکن ایک بات دونوں ساتھی سمجھ گئے کہ ضرور کوئی نقطہ ہے جو اس کو مل گیا ہے۔ کیوں کہ اب اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

کوٹ لکھپت جیل میں بہادر کی کوٹھڑی میں داخل ہو کر جمیل نے بہادر سے کہا "میرے پاس تمھیں سمجھانے کے لیے بالکل وقت نہیں، جلدی سے میرے سوالوں کے جوابات دو۔ دھیان رہے کہ قتل کے وقت تم پارک میں ایک مولوی صاحب سے بات کر رہے تھے۔ ٹھیک ؟" بہادر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم ان سے کس زبان میں بات کر رہے تھے۔ پشتو میں یا پنجابی میں ؟"

"مولوی صاحب کو پشتو نہیں آتی تھی اور مجھے پنجابی نہیں آتی ہے اس لیے ہم اردو میں بات کر رہے تھے۔" بہادر نے جواب دیا۔

"اب غور سے سنو! مولوی صاحب نے کہا کہ وہ اسٹیشن جا رہے ہیں۔ کہاں جانے کے لیے ؟" جمیل نے پوچھا۔

"سلام آباد۔ میں نے آپ کو بتایا تو ہے۔"

جمیل نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا، پھر بہادر سے پوچھا، "ایک سوال اور! کیا انھوں نے اس طرح کہا تھا ۔۔۔ اسلام آباد۔" جمیل نے پنجابی لہجہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں! بالکل اسی طرح، سلام آباد۔" بہادر نے کہا۔ الیاس اور ہمایوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اب وہ سمجھ گئے تھے کہ جمیل کے ذہن میں کیا ہے۔

"ایک اور سوال۔" جمیل نے پوچھا، "کیا مولوی صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ملتان عرس میں جا رہے ہیں ؟"

"ہاں، انھوں نے یہ کہا تھا۔" بہادر کے جواب سے جمیل کو بڑی مایوسی ہوئی، لیکن بہادر اب کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"ایک منٹ! مجھے ذرا سوچنے دو ۔۔۔۔ نہیں انھوں نے صرف مزار کہا تھا کہ وہ سلام آباد سے کسی مزار پر جائیں گے۔"

جمیل نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر بہادر سے پوچھا، "ایک بات بتاؤ بہادر! سلام آباد ایک چھوٹا سا قصبہ ہے تمھیں اس کا خیال کیسے آیا، اور پھر ملتان کا عرس !"

جب مولوی صاحب مجھے ملے تھے میں پارک میں بنچ پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ خبر تھی کہ ملتان میں عرس شروع ہونے والا ہے۔ ملتان کے قریب سلام آباد میں میرے ماموں رہتے ہیں۔ سلام آباد کا نام میرے لیے بڑا جانا پہچانا ہے۔ اس لیے جب مولوی صاحب نے سلام آباد اور عرس کا ذکر کیا تو کیوں کہ پہلے سے میرے دماغ میں ملتان کا عرس تھا اس لیے میں نے یہی سمجھا۔"

انسپکٹر جمیل فوراً کھڑا ہو گیا۔ "ٹھیک ہے بہادر اتنا کافی ہے۔"

جیل سے باہر نکل کر جمیل نے اپنے ساتھیوں سے کہا، "دیکھا تم لوگوں نے، ہم لوگ بالکل غلط سمت میں اپنا وقت ضائع کر رہے تھے۔ کہاں ملتان اور کہاں اسلام آباد ایک شمال میں ہے تو دوسرا جنوب میں بالکل مخالف سمت۔ مولوی صاحب نے دراصل ملتان کے عرس نہیں بلکہ اسلام آباد یا پنڈی کے کسی بزرگ کے عرس پر جانے کی بات کی ہوگی۔ جہاں ہم نے اب تک انھیں تلاش نہیں کیا۔ اب اللہ سے دعا کرو کہ میں جلدی سے اسلام آباد پہنچ جاؤں۔"

۵

لاہور سے اسلام آباد جانے والی ٹرین تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ ٹرین کے ایئر کنڈیشنڈ پارلر میں جمیل اپنی سیٹ پر بیٹھا بظاہر اونگھ رہا تھا، لیکن حقیقت میں اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

پنڈی اگر جہاز سے جاتا تو ٹرین سے بھی بعد میں پہنچتا کیوں کہ ٹرین دو بجے پہنچ جائے گی جب کہ جہاز تقریباً تین بجے پہنچتا اور اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے ایک گھنٹہ نہیں تھا۔ انسپکٹر ہمایوں نے پنڈی پولس کو فون کر دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ پنڈی اسٹیشن پر پنڈی پولس کی گاڑی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اور پولس کی تیز گاڑی میں وہ جلد اسلام آباد پہنچ جائے گا۔ لاہور تھانے سے پنڈی پولس کو پنڈی اور اسلام آباد میں موجود تمام ایسی جگہوں کی فہرست تیار کر کے ان کی چیکنگ کرنے کی ہدایات کر دی گئی تھیں۔ پنڈی پولس کو مولوی صاحب کا حلیہ بھی بتا دیا گیا تھا۔ اس کو امید تھی کہ پنڈی پولس نے اب تک مولوی صاحب کی تلاش شروع کر دی ہوگی۔ اگر پنڈی پولس نے مولوی صاحب کو ڈھونڈھ نکالا تو بہادر کی زندگی بچانے کے لیے بس ایک ٹیلے فون کوٹ لکھپت جیل میں جیلر کو کرنے کی ضرورت ہوگی اور جیلر پھانسی کو ملتوی کر دیں گے جو اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کا اسسٹنٹ اب تک جیلر صاحب کو یہ بتانے جا چکا ہوگا کہ ہو سکتا ہے جمیل پنڈی سے فون کرے اور پھانسی ملتوی کرنی پڑے۔ الیاس جیل میں انسپکٹر جمیل کے فون آنے تک رکے گا۔

"کاش میں فون کر سکوں۔" جمیل نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ ٹرین کی رفتار اچانک سُست ہو گئی تو اُس نے آنکھیں کھولیں۔ عجیب بات ہے جہلم سے پنڈی تک اس ریل کار کو کسی اسٹیشن پر نہیں رکنا تھا۔ پھر یہ ٹرین کی رفتار سُست کیوں ہو گئی

ہے۔ ٹرین کی رفتار مزید کم ہو گئی حتیٰ کہ اب ٹرین تقریباً رینگنے لگی۔ انسپکٹر جمیل اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔ اور پارلر کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ جہاں ایک گارڈ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ جمیل نے اس سے پوچھا، "ٹرین اتنی سُست کیوں ہو گئی ہے؟"

"اس علاقے میں پچھلے چار دِنوں سے مسلسل بارش ہو رہی ہے، ریلوے لائن پر جگہ جگہ مٹی کے تودے گرے ہوئے ہیں۔ لاہور اسٹیشن چھوڑنے سے پہلے ہمیں مطلع کر دیا گیا تھا۔ اس لیے ہم احتیاطاً آہستہ چلیں گے۔" گارڈ نے جواب دیا۔

انسپکٹر جمیل نے پریشانی سے اپنی گھڑی دیکھی۔ ٹرین کو پنڈی اسٹیشن دو بجے پہنچنا تھا، لیکن اب اگر ٹرین اس رفتار سے چلی تو ساڑھے تین بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہادر کی جان بچانے کے لیے وقت اور بھی کم رہ جائے گا۔ اب اس کو افسوس ہونے لگا کہ وہ جہاز سے ہی کیوں نہیں آ گیا۔ اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ ٹرین جس وقت پنڈی اسٹیشن پر رُکی انسپکٹر جمیل کی گھڑی میں پورے پونے چار بج رہے تھے۔ پنڈی میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ انسپکٹر جمیل لوگوں کو ہٹاتا ہوا تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔ جہاں انسپکٹر سلمان عثمانی ایک پولس کار میں انسپکٹر جمیل کا انتظار کر رہا تھا۔ انسپکٹر سلمان عثمانی بھی انسپکٹر جمیل کی طرح نہایت ہوشیار اور فرض شناس پولس افسر تھا اور فضول باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے فوراً اصل بات شروع کر دی۔

"ہم نے پنڈی کے آس پاس تمام جگہیں دیکھ لی ہیں، لیکن ہمیں آپ کے بتائے ہوئے حلیے کا کوئی مولوی نہیں ملا ہے۔ اب صرف ایک جگہ رہ گئی ہے۔ بری امام، یہ اسلام آباد کے علاقے میں ایک درگاہ ہے۔ اب یہ آپ کی آخری امید ہے۔"

"وہاں تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟" انسپکٹر جمیل نے پوچھا۔

"عام حالات میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے، لیکن کیوں کہ تیز بارش ہو رہی ہے۔ اور ایسے میں تیز گاڑی چلانا خطرناک ہے۔ اس لیے میں کوشش کرتا ہوں کہ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جائیں۔" انسپکٹر سلمان نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم تقریباً ساڑھے پانچ بجے وہاں پہنچیں گے۔" انسپکٹر جمیل

نے فکر مندی سے کہا، "بہادر کی پھانسی کا وقت چھے بجے ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ کوشش تو کر رہے ہیں۔ یہ جگہ بھی آخری ہے۔ اگر مولوی صاحب یہاں نہیں ملے تو اس کی زندگی کا آخری موقع ختم!" انسپکٹر سلمان نے کہا۔

گاڑی بارش کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ پنڈی تک تو اس کی رفتار مناسب رہی، لیکن جیسے ہی وہ اسلام آباد میں داخل ہوئی رفتار سست ہو گئی تیز بارش میں پہاڑی راستے بہت ہی پھسلنے ہو جاتے ہیں۔ اور تیز رفتاری نہایت خطرناک ہوتی ہے۔ ایسے میں بریک بھی گاڑی کو روکنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اسلام آباد کی چوڑی سڑکوں پر کچھ دیر چل کر اب انسپکٹر سلمان نے گاڑی ایک پتلی سڑک پر ڈال ڈال دی۔ رفتار مزید کم ہو گئی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، انسپکٹر جمیل کی بے چینی بڑھ رہی تھی، اس کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو رہا تھا۔ آخر اللہ اللہ کر کے گاڑی بری امام کے مزار پر رُکی۔ انسپکٹر جمیل نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ بہادر کو بچانے کے لیے صرف ۳۵ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔

انسپکٹر جمیل اور انسپکٹر سلمان سیدھے درگاہ کے سجادہ نشین کے پاس پہنچے۔ اور ان سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"آپ کے بتائے ہوئے حلیے پر صرف ایک ہی شخص پورا اُترتا ہے۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا، "اور وہ ہیں مولوی نصیر الدین! ..... آئیں میں آپ کو ان سے ملواتا ہوں۔" دونوں انسپکٹرز ان کے ساتھ چل دیے۔ انسپکٹر جمیل کے اعصاب میں اب مزید تناؤ پیدا ہو رہا تھا۔ اور وہ جلد سے جلد مولوی نصیر الدین کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ آخر وہ ایک چھوٹے سے کمرے کے باہر رک گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جمیل کے سامنے ایک مولوی صاحب کھڑے تھے جن کا حلیہ بالکل وہی تھا جو بہادر نے بتایا تھا۔

انسپکٹر جمیل نے اپنی جیب سے بہادر کی تصویر نکالی اور مولوی صاحب کو دکھائی،

"مولوی صاحب آپ نے اس شخص کو کبھی دیکھا ہے؟"

"ہاں! یقیناً دیکھا ہے؟" مولوی صاحب نے جواب دیا۔

"کب اور کہاں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مولوی صاحب نے بہادر سے اپنی ملاقات کا قصہ سنا دیا جو بالکل وہی تھا جیسا کہ بہادر نے بیان کیا تھا۔

"اس بات پر کسی کو شک ہے؟ اس کو یہاں لائیں میں ان کو بتا دوں گا کہ یہ سچ ہے۔ مولوی صاحب نے کہا۔

"ایک مولوی صاحب جن کے سر اور ڈاڑھی کے بال سرخ ہوں، ناک کسی چوٹ کی وجہ سے ٹیڑھی ہو اور جو تاش کے کرتب جانتے ہوں۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ بلکہ آپ کا ملنا بالکل ناممکن سا لگتا تھا۔" انسپکٹر جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔" مولوی صاحب نے کہا، "لیکن جہاں تک میری ناک کا سوال ہے یہ چوٹ جب لگی تھی جب میں شوقیہ باکسنگ کیا کرتا تھا۔ اور تاش کے کرتب بھی جوانی کی بات ہے جب میں اسکول میں پڑھاتا تھا تو میں نے بچّوں کو خوش کرنے کے لیے سیکھے تھے۔ اس دن بہادر کی جیب سے تاش کے پتّے جھانک رہے تھے تو پرانی رگ پھڑک اٹھی اور میں نے کچھ کرتب بہادر کو سکھا دیے۔ کیا آپ بھی دیکھنا پسند کریں گے؟"

"نہیں مولوی صاحب شکریہ اس وقت نہیں! پھر کبھی سہی۔ دراصل اس وقت مجھے اسلام آباد کے کسی پولیس اسٹیشن یا کسی ایکسچینج سے لاہور فون کرنا ہے یہ بہت ضروری ہے۔"

"لیکن اب آپ لوگ واپس نہیں جا سکتے، کیوں کہ ابھی جس سڑک سے آپ یہاں پہنچے ہیں۔ مٹّی کے تودے گرنے کی وجہ سے بند ہو گئی جو ظاہر ہے کل صبح سے پہلے نہیں کھل سکتی۔ اور اس علاقے کے سارے ٹیلے فون برسوں سے خراب ہیں۔ شاید کوئی تار ٹوٹ گئی ہے۔" مولوی نصیر الدین نے اطلاع دی۔

"پھر ہم کہاں سے فون کر سکتے ہیں؟" انسپکٹر جمیل نے پریشانی سے پوچھا،

"اسلام آباد سے کر سکتے ہیں۔ ایک پتلا سا پہاڑی راستہ یہاں سے مری روڈ کی طرف نکلتا ہے، جو گھوم کر زیرو پوائنٹ پر نکل جائے گا۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"اس میں کتنی دیر لگ جائے گی؟" انسپکٹر جمیل نے پوچھا۔

"کم از کم آدھا پون گھنٹہ تو لگ جائے گا۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"لیکن میرے پاس ایک آدمی کی جان بچانے کے لیے صرف پندرہ منٹ ہیں۔ اُف! اس ایٹمی دَور میں ہم بارش کی وجہ سے کتنے مجبور ہیں۔ سب مشین اور الیکٹرانک سب بے کار ہیں۔"

"الیکٹرانک! اوہ، ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"وہ کیا جلدی بتائیں؟"

"یہاں قریب ہی ایک نوجوان سائنس داں رہتا ہے۔ جس نے شوقیہ ایک لیباریٹری بنائی ہوئی ہے۔ طرح طرح کے تجربے کرتا رہتا ہے۔ اس کے پاس ایک وائرلیس سیٹ بھی ہے۔" مولوی صاحب نے بتایا۔

"وہاں تک کیسے جایا جاسکتا ہے؟" انسپکٹر جمیل نے جلدی سے پوچھا۔

"میرے ساتھ آؤ میں لیے چلتا ہوں۔" مولوی صاحب نے کہا۔

تینوں گاڑی میں بیٹھے اور مولوی صاحب کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے۔ جب وہ سائنس داں کے دروازے پر دستک دے رہے تھے تو چھے بجنے میں صرف نو منٹ باقی تھے۔ اور ٹھیک اس وقت لاہور میں انسپکٹر جمیل کا اسسٹنٹ الیاس فرید جیلر کے آفس میں پریشانی سے ٹہل رہا تھا۔ وہ بار بار ایک جملہ دہرا رہا تھا۔ "کیا بات ہے اب تک انسپکٹر جمیل نے فون نہیں کیا۔۔۔۔ ان کو فون تو کرنا چاہیئے تھا، چاہے بُری خبر ہی سناتے۔۔۔۔"

"مجھے افسوس ہے الیاس۔" جیلر صاحب نے کہا، "لیکن میں بغیر کسی وجہ کے پھانسی ملتوی نہیں کرسکتا۔ چلو تمہاری خاطر پانچ منٹ اور دیکھ لیتے ہیں، اس سے زیادہ نہیں۔"

الیاس مایوسی سے ٹیلے فون کو گھورنے لگا۔

وہاں اسلام آباد میں انسپکٹر جمیل بے چینی سے سائنس داں کو وائرلیس سیٹ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آخرکار سائنس داں بول اُٹھا۔ "مل گئی، لائن مل گئی، لاہور تھانے سے لائن مل گئی۔"

انسپکٹر جمیل نے جلدی سے ریسور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "ہیلو!۔۔۔۔ میں انسپکٹر جمیل بول رہا ہوں۔ فوراً کوٹ لکھپت جیل فون کرو۔ اور ان کو بتادو کہ بہادر کا گواہ مل گیا

ہے۔ وہ بے گناہ ہے۔ اس کی پھانسی روک دیں۔۔۔۔ میں دوبارہ کہہ رہا ہوں، پھانسی روک دیں۔۔۔ اوور۔"

وہاں جیل میں جیلر صاحب نے گھڑی دیکھی، چھے بجنے میں صرف چار منٹ باقی تھے۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ "اب مزید انتظار نہیں کیا جاسکتا۔۔۔ تم میرے ساتھ آرہے ہو الیاس؟"

"نہیں!۔۔۔ میں ابھی اور انتظار کروں گا۔" الیاس نے کہا۔

جیلر صاحب باہر چلے گئے۔ الیاس مایوسی سے گھڑی کو گھورنے لگا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی الیاس نے بجلی کی سی تیزی سے فون اُٹھایا۔ کچھ دیر پیغام سُنا پھر کہا، "اللہ تیرا شکر ہے۔" فون بند کیا اور جلدی سے جیلر صاحب کی طرف دوڑا۔ اسی لمحے گھڑی نے چھے کا گھنٹہ بجایا۔

اسلام آباد میں انسپکٹر جمیل وائرلیس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی اندرونی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ مضبوط اعصاب کا مالک انسپکٹر جمیل بھی اب تھکا تھکا سا نظر آرہا تھا۔ اچانک وائرلیس چیخ اُٹھا، "انسپکٹر جمیل۔۔۔۔ انسپکٹر جمیل۔"

انسپکٹر جمیل نے ریسور اٹھایا، "یس۔۔۔ انسپکٹر جمیل۔۔۔ اسپیکنگ۔"

"ہیلو۔۔۔ میں الیاس بول رہا ہوں۔" الیاس کی خوشی سے بھرپور آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ "آپ کا پیغام وقت پر پہنچ گیا۔۔۔ پھانسی روک دی گئی ہے۔ مبارک ہو سر!"

کمرے میں بیٹھے ہوئے چاروں افراد کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انسپکٹر جمیل، انسپکٹر سلمان، مولوی صاحب اور نوجوان سائنس داں، شاہد کامران جس نے اس مہم میں ایک اہم کام سر انجام دیا۔ سب نے خوشی سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔

"یہ ہم سب کا ساتھ کام کرنے اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا نتیجہ ہے۔" انسپکٹر جمیل نے کہا۔

"سچ ہے اگر سب مل کر کام کریں تو دنیا کا کوئی کام ناممکن نہیں۔" مولوی صاحب نے کہا۔

خط کی چوری

پت جھڑ کا موسم تھا۔ زور کی ہوا چل رہی تھی۔ میں اپنے دوست جلال کے ساتھ اُس کی چھوٹی سی لائبریری میں بیٹھا اپنے خیالات میں گُم تھا۔ سامنے چائے کی پیالی رکھی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر میں اس کا ایک گھونٹ لے کر اچھی چائے کا لُطف اُٹھا رہا تھا۔ ہم دونوں آدھ گھنٹے سے اسی طرح خاموش بیٹھے تھے اور یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دو بہت گہرے دوست خاموش بیٹھے بھی ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ میں اپنے کچھ ذاتی معاملات پر غور کر رہا تھا۔ مجھے اپنے مکان کے آس پاس جو نئی عمارتیں بن رہی تھیں پسند نہیں تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی اور جگہ کوئی ڈھنگ کا مکان مِل جائے تو خرید لیا جائے۔ جلال شاید کسی واردات پر غور کر رہا ہوگا۔ وہ ایک مشہور سراغ رساں تھا اور اپنے کام میں بہت ماہر بڑی بڑی مشکل گتھیاں اس نے سلجھائی تھیں۔

ہم دونوں اپنی اپنی سوچ میں تھے کہ اچانک دروازہ کُھلا اور چیف انسپکٹر سراج اندر داخل ہوئے۔ ہم دونوں نے بڑی گرم جوشی سے اُٹھ کر اُن کا استقبال کیا۔ وہ جلال کے پُرانے دوست تھے اور میرے بھی۔ جلال کی دوستی تو خیر اس وجہ سے تھی کہ دونوں کا کام ایک ہی نوعیت کا تھا اور اکثر انھیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی مگر میری دوستی اس لیے تھی کہ ہم دونوں کالج کے دنوں میں ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ پھر ہماری تعلیم ختم ہو گئی اور ہمارے راستے بھی ایک

دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ کئی سال باہر رہنے کے بعد جب میں اپنے وطن واپس آیا تو سراج کو شہر کی پولس کا سربراہ پایا۔ جلال اور میں تو خیر بچپن ہی سے دوست تھے۔ میں اُس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

اب شام ہو گئی تھی اور کمرے میں اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ ہم اپنی اپنی سوچ میں ایسے گُم تھے کہ روشنی کرنا ہی بھول گئے۔ سراج نے آتے ہی پہلے تو لیمپ روشن کیا اور پھر جلال کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا :

"جلال میں تم سے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں مشورہ کرنے آیا ہوں بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ تمھاری رائے لینے آیا ہوں۔ یہ مسئلہ کچھ ایسا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"اگر معاملہ ایسا ہے کہ تمھاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو پھر کمرے میں اندھیرا ہی رہنے دیتے۔" جلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تمھاری عجیب عادت ہے۔ تمھیں بات اندھیرے ہی میں سوجھائی دیتی ہے۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خیر بتاؤ کیا معاملہ ہے۔ کیا کوئی قتل وتل ہو گیا؟" جلال نے پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ معاملہ سیدھا سادہ ہے۔ مگر میں نے سوچا تم سے مشورہ کر لوں۔ کچھ عجیب سی بات ہے۔"

"سراج تم بھی خوب آدمی ہو۔ کہتے ہو کہ معاملہ سیدھا سادہ ہے اور پھر عجیب سا بھی ہے۔" جلال بولا۔

"ہاں بھئی۔ معاملہ تو سیدھا سادہ ہے، لیکن بات سمجھ میں آنہیں رہی ہے اور یہی ساری اُلجھن ہے۔ ایک سادہ سی بات ہے اور اتنی پریشان کر رہی ہے۔"

"بس میں سمجھ گیا۔ تمھاری سمجھ میں بات اس لیے نہیں آرہی کہ معاملہ بہت سیدھا سادہ ہے۔" جلال بولا۔

"بھئی میں تم سے مشورہ کرنے آیا ہوں اور تم مذاق کے موڈ میں ہو۔" انسپکٹر سراج نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"اچھا ناراض نہ ہو، بتاؤ کیا معاملہ ہے؟" جلال نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

میں خاموش بیٹھا ان دونوں کی باتیں سُن رہا تھا اور دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ سراج ایک محنتی اور فرض شناس پولس افسر تھا، لیکن بات اس کی سمجھ میں ذرا دیر سے آتی تھی۔ ہم کالج کے دِنوں میں بھی اُس سے اسی طرح تفریح لیتے تھے۔ ہمارے مذاق کا وہ کبھی بُرا نہیں مانتا تھا۔ وہ یوں بھی میرا بہت لحاظ کرتا تھا۔

"سنو۔ میں چند لفظوں میں پوری بات بتائے دیتا ہوں مگر یہ یاد رہے کہ یہ معاملہ رازداری کا ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہوگیا کہ میں نے یہ راز کسی کو بتایا ہے تو شاید مجھے نوکری ہی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔" سراج بولا۔

"خیر ٹھیک ہے۔ تم بات تو بتاؤ۔"

"مجھے رازداری کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ شاہی محل سے ایک دستاویز جو بہت اہمیت رکھتی ہے چُرالی گئی ہے۔ کس نے چرائی ہے یہ بھی معلوم ہے کیوں کہ دیکھنے والے نے اُسے اُٹھاتے دیکھا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ دستاویز ابھی تک اُسی کے قبضے میں ہے۔"

"یہ کیسے معلوم ہُوا کہ وہ دستاویز ابھی تک اُس کے قبضے میں ہے۔" جلال نے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ اگر یہ دستاویز چُرانے والے کے قبضے سے نِکل جاتی تو اس کا فوراً پتا چل جاتا۔ اس دستاویز کی نوعیت ایسی ہے کہ جس کو یہ ملے گی وہ اس کو ضرور کام میں لانے کی کوشش کرے گا۔"

"ذرا کُھل کر بات بتاؤ۔" میں نے اس معاملے میں دِل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"سنو۔" سراج بولا۔ "بات یہ ہے کہ اگر وہ دستاویز ایک تیسرے آدمی پر جس کا نام میں نہیں لوں گا ظاہر ہو جائے تو اس سے ایک بہت ہی اعلا شخصیت کی عزّت خطرے میں پڑجائے۔ اسی وجہ سے جس شخص کے قبضے میں یہ دستاویز ہے، وہ اس اعلا شخصیت کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ اعلا شخصیت پریشان ہے۔"

"بھئی صاف صاف بات کرو۔ معاملے کو الجھاؤ نہیں، چور کون ہے اور اُسے یہ جُرأت کیسے ہوئی جب کہ اس 'شخصیت' کو چور کا عِلم ہے۔" جلال نے کہا۔

"چور ہے وزیرِ جنگ۔ اور تم جانتے ہو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ چوری جس طرح ہوئی اُس میں جرأت کے علاوہ ذہانت کا بھی کمال ہے۔ وہ دستاویز، بلکہ میں اب صاف

بتادوں، خط اس 'شخصیت' کو ایسے وقت ملا جب وہ شاہی محل میں اپنے کمرے میں تنہا اِس خط کو پڑھ رہی تھیں کہ ایک اور بڑی شخصیت جس سے وہ اس خط کو چھپانا چاہتی تھیں کمرے میں داخل ہوئی۔ انھوں نے جلدی سے اُس کو ایک دراز میں ڈالنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس میں کام یاب نہیں ہوئیں۔ مجبوراً انھوں نے اُس خط کو اُسی طرح اُلٹا میز پر رکھ دیا تاکہ خط کا مضمون نظر نہ آئے۔ اُسی وقت وزیر صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور ان کی تیز نگاہ نے فوراً خط کی پشت پر لکھے ہوئے پتے سے یہ اندازہ لگا لیا کہ خط کس کا ہے۔ انھوں نے اُس 'شخصیت' کے چہرے پر پریشانی دیکھ لی اور بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ کچھ سرکاری معاملات کو اپنی عادت کے مطابق جلدی جلدی بھگتاتے ہوئے اپنی جیب سے اُس خط سے مِلتا جُلتا ایک خط نکال کر کھولا اور بظاہر پڑھا اور پھر اس دوسرے خط کے ساتھ مِلا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ کوئی پندرہ منٹ تک سرکاری معاملات پر بات کرتے رہے اور پھر رخصت ہوتے ہوئے اپنا خط وہیں چھوڑ کر پہلے سے رکھا ہُوا خط اُٹھا کر چلتے بنے۔ یہ ساری حرکت وہ اعلا شخصیت خاتون دیکھ رہی تھیں مگر تیسرے شخص کی موجودگی میں وہ اُسے روکنے کی جرأت نہیں کرسکتی تھیں۔"

"تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ چور نے اُس اعلا شخصیت خاتون کو یہ جتا بھی دیا کہ وہ اُن کے راز سے واقف ہے۔" جلال نے کہا۔

"ہاں۔" انسپکٹر سراج نے جواب دیا۔ "اور وہ اس سے خطرناک حد تک فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ خاتون اِس صورتِ حال سے پریشان ہو گئی ہیں اور چاہتی ہیں کہ کسی طرح اُس شخص کے ہاتھ سے وہ خط نِکل آئے۔ وہ کُھلے طور پر ایسا نہیں کر سکتیں چناں چہ انھوں نے یہ کام میرے سپرد کیا ہے۔"

"اور آپ سے زیادہ سمجھ دار آدمی انھیں اس کام کے لیے مِل نہیں سکتا۔" جلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہو۔" سراج بولا۔

"ہو سکتا ہے یہی خیال اُن خاتون کا بھی ہو۔"

خیر یہ تو طے ہے کہ وہ خط ابھی تک وزیر صاحب کے قبضے میں ہے اور اس خط کو وہ دباؤ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اگر وہ خط کو ظاہر کر دیں تو پھر یہ حربہ اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔" میں نے کہا۔

"بالکل یہی بات ہے، اور میں نے اسی یقین کے ساتھ کارروائی کی ہے۔ سب سے پہلے میں نے وزیر کے گھر کی پوری تلاشی لی ہے۔ اس کام میں دشواری یہ تھی کہ گھر کی تلاشی اس طرح لینی تھی کہ وزیر صاحب کو پتا نہ چلے۔ پھر مجھے یہ بھی خبردار کر دیا گیا تھا کہ اگر وزیر کو پتا چل گیا کہ میں خط کی تلاش میں ہوں تو نتیجہ خطرناک ہوگا۔"

"لیکن تم تو اس قسم کی کارروائیاں پہلے بھی کر چکے ہو۔ تمھارا محکمہ تو ان کاموں میں بہت ہوشیار ہے۔" جلال نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں" سراج نے کہا" میں نے بڑی ہوشیاری سے یہ کام کیا۔ وزیر صاحب کی عادتیں ایسی ہیں کہ مجھے ان سے بھی مدد ملی۔ وہ اکثر رات رات بھر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ان کے نوکروں کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ وہ وزیر کے کمرے سے بہت دُور سوتے ہیں اور وہ نشے کے بھی شوقین ہیں۔ تم کو معلوم ہے میرے پاس ایسی چابیاں ہیں کہ میں شہر کے کسی بھی کمرے یا الماری کو کھول سکتا ہوں۔ پچھلے تین مہینوں میں کوئی رات بھی ایسی نہیں گزری جس کا زیادہ تر حصّہ میں نے وزیرِ جنگ کے گھر کی تلاشی لینے میں نہ گزارا ہو۔ میں نے کونا کونا چھان مارا ہے۔ یہ نہ صرف میری عزّت کا معاملہ ہے بلکہ میں تمھیں یہ راز بھی بتا دوں کہ اس خط کو وزیر کے پاس سے اُڑا دینے پر مجھے بڑا انعام ملے گا۔ میں نے اس وقت تک اپنی تلاش جاری رکھی جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو گیا کہ چور مجھ سے زیادہ ہوشیار ہے۔"

"اچھا کیا یہ ممکن نہیں کہ وزیر صاحب نے وہ خط اپنے گھر ہی میں نہ رکھا ہو۔ کہیں اور چھپا دیا ہو۔" میں نے سوال کیا۔

"یہ مشکل ہے کیوں کہ آج کل دربار شاہی کے جو حالات ہیں اور وزیر صاحب جس قسم کی سازشوں میں لگے ہوئے ہیں اُس کو دیکھتے ہوئے یہ خیال نہیں کیا

جاسکتا کہ وہ اتنے اہم خط کو کہیں اور رکھیں گے۔ یہ خط تو ان کے پاس ہی ہونا چاہیئے تاکہ فوراً پیش کیا جا سکے۔" انسپکٹر سراج نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر تو یہ خط یقیناً اُسی عمارت میں ہوگا۔ وہ اسے اپنے پاس تو رکھتے نہیں ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے ان کی تلاشی بھی لے کر دیکھ لی ہے۔ میرے آدمی دو مرتبہ اُن پر جھپٹ چکے ہیں۔ وہ خط نہیں ملا۔" انسپکٹر سراج نے کہا۔

"تم کو اتنی زحمت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اتنا احمق نہیں ہے کہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ خط حاصل کرنے کے لیے یہ حرکت کی جائے گی۔" جلال نے کہا۔

"نہیں احمق تو نہیں ہے مگر طبیعت اُس کی شاعرانہ ہے۔"

"خیر تم مجھے اپنی تلاشی کی تفصیل تو بتاؤ۔"

"سنو۔ میں نے ساری عمارت کے ایک ایک کمرے کی تلاشی لی۔ پہلے ہم نے ہر کمرے کا فرنیچر دیکھا۔ اس کے بعد ایک ایک دراز کھولی اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ پولس کے آدمی سے کوئی خفیہ دراز چھُپی نہیں رہ سکتی۔ ہم نے یہ کام بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کیا۔ الماریوں اور صندوقوں کے بعد ہم نے کرسیوں کو لیا۔ گدوں اور تکیوں کو پتلی اور لمبی سُوئیوں سے گود کر دیکھا میزوں کے اوپر کے تختے اُتار کر دیکھ ڈالے۔"

"یہ کیوں؟"

"بعض دفعہ لوگ چیز کو چھُپانے کے لیے میز کا اوپر کا تختہ الگ کر دیتے ہیں اور پھر پائے کو کھوکھلا کر کے اُس کے اندر وہ چیز رکھ دیتے ہیں اور اوپر سے تختہ جوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح مسہری کے سرہانے اور پائے استعمال کیے جاتے ہیں۔"

"کیا ٹھونک بجا کر معلوم نہیں کیا جاسکتا اندر خلا ہے یا نہیں۔"

"ہاں، لیکن کبھی کبھی موٹی روئی وغیرہ رکھ دی جاتی ہیں۔ پھر ہم اپنا کام خاموشی سے کرنا چاہتے تھے۔"

"لیکن تم ہر فرنیچر کو تو اس طرح نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کیا تم نے کرسیوں کے پائے اور ہتھے بھی الگ کر کے دیکھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، لیکن ہم نے اس سے بڑھ کر کام کیا۔ ہم نے ایک طاقت ور خرد بین لے کر کرسیوں کے جوڑ جوڑ کو دیکھا کہ کہیں حال ہی میں تو کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی ہے۔"

"لکڑی کے تختوں اور شیشوں کے درمیان جگہ اور مسہری، بستر، پردے اور قالین بھی دیکھ لیے ہوئے ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی۔ ان سب چیزوں کی اچھی طرح تلاشی لی گئی پھر پورے گھر کی دیواروں اور فرش کا معائنہ کیا گیا۔ نہایت سائنٹفک طریقے پر پورے گھر کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور پھر ایک ایک حصّے کی تلاشی لی گئی۔ ہم نے احتیاط کے طور پر اِدھر اُدھر کے مکانوں کی بھی تلاشی لے ڈالی۔"

"اس میں تو تمھیں بڑی دشواری پیش آئی ہوگی۔" جلال نے کہا۔

"ہاں، مگر یہ بھی تو دیکھو انعام کتنا بڑا ہے۔"

"کیا آس پاس کی زمین بھی دیکھ لی؟"

"ہاں، فرش اینٹوں کا ہے۔ اس لیے دشواری نہیں ہوئی۔"

"تم نے وزیر کے کاغذات بھی دیکھ لیے اور ان کی لائبریری میں کتابیں بھی؟"

"ہاں بھئی، کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ کتابوں کا ایک ایک صفحہ کھول کر دیکھ لیا۔ اُن کی جلدوں تک کا اچھی طرح معائنہ کر لیا۔"

"قالینوں کے نیچے فرش کا بھی معائنہ کیا اور دیواروں پر لگا ہُوا کاغذ بھی دیکھ لیا؟"

"ہاں، ایک ایک قالین اٹھا کر فرش کا معائنہ کیا۔"

"تہ خانے بھی دیکھے؟"

"ہاں دیکھے۔"

"پھر تو تمھارا اندازہ غلط ہے۔ خط اس عمارت میں نہیں ہے۔" میں نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"ہاں شاید تمھارا خیال صحیح ہے۔"

جلال اِس تمام گفت گو کو دل چسپی سے سُن رہا تھا اور اُس کے چہرے پر ہلکی

سی مسکراہٹ تھی۔ انسپکٹر سراج اب اس کی طرف متوجہ ہُوا۔

"بھئی جلال، اب تم بتاؤ۔ میں کیا کروں؟"

"ایسا کرو کہ پوری عمارت کو ایک مرتبہ اور چھان ڈالو۔" وہ بولا۔

"نہیں۔ اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ مجھے اب یقین ہے کہ خط اس عمارت میں نہیں ہے۔" سراج نے کہا۔

"پھر تو میں تمھیں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ البتہ مجھے یہ بتاؤ کہ وہ خط کس قسم کا ہے، یعنی اس کا سائز کیا ہے اور کاغذ وغیرہ کیسا ہے؟"

سراج نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور خط کی تفصیلات بتانے لگا۔ پھر کچھ مایوس سا ہو کر چلا گیا۔

۲

کوئی پندرہ بیس روز بعد وہ پھر ہمارے ہاں آیا۔ اب کے بھی ہم اسی طرح بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اُس نے ایک کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔

مجھے وہ کیس یاد آ گیا جس پر وہ جلال سے مشورہ لینے آیا تھا اور جلال نے اُس کو یوں ہی چلتا کر دیا تھا۔

"سراج اُس خط کا کیا ہُوا۔ میرا خیال ہے تم نے وزیر سے ہار مان لی۔"

"اللہ غارت کرے اس کو۔ میں نے جلال کے کہنے پر دوبارہ اُس کے گھر کی تلاشی لی تھی، لیکن بے کار۔ مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ وہاں کچھ نہیں ملے گا۔"

"اچھا دوست یہ تو بتاؤ، اگر خط تمھارے ہاتھ لگ جائے تو تمھیں انعام کتنا ملے گا؟" جلال نے پوچھا۔

"بہت بڑا انعام ہے۔ میں تمھیں رقم تو نہیں بتا سکتا، لیکن ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص مجھے وہ خط لا کر دے دے تو میں اس کو پچاس ہزار رُپے کا چیک دینے کو تیار ہوں۔ سچّی بات یہ ہے کہ معاملہ روز بہ روز گھمبیر ہوتا جا رہا ہے۔ میرے انعام کی رقم دوگنی کر دی گئی ہے، لیکن افسوس کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

جلال بولا، "میرے خیال میں تم نے اتنی محنت نہیں کی جتنی کہ کرنی چاہیے تھی۔"

"کیا مطلب؟ میں نے اپنی سی ہر ممکن کوشش کر لی۔ جو کچھ انسان کے بس میں ہو سکتا ہے وہ میں نے کیا ہے۔" سراج کہنے لگے۔

"تم نے ڈاکٹر پال کا واقعہ سنا ہے؟"

"نہیں۔" سراج چڑ کر بولا، "لعنت بھیجو ڈاکٹر پال پر۔"

"ضرور لعنت بھیجو مگر پہلے واقعہ سن لو۔ ایک دولت مند آدمی نے جو بُلا کا کنجوس تھا سوچا کہ ڈاکٹر پال سے مفت طبّی مشورہ حاصل کیا جائے کیوں کہ ان کی فیس بہت تھی۔ چناں چہ اُس نے ایک محفل میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے ڈاکٹر پال کو اس طرح اپنی بیماری کا حال بتایا جیسے وہ کسی اور کی بیماری کا حال ہو۔ اور ان سے کہنے لگا، "ڈاکٹر صاحب فرض کیجیے اگر اس شخص میں فلاں فلاں بیماری کی علامات موجود ہوں تو آپ کے خیال میں اُس کو کیا کرنا چاہیے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا، "میرے خیال میں تو اُسے کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔"

انسپکٹر سراج نے کچھ ناگواری سے کہا:

"مگر میں نے تو مفت مشورہ نہیں مانگا۔ میں تو فیس دینے کو تیار ہوں۔ اگر کوئی اس خط کے حاصل کرنے میں میری مدد کرے تو میں پچاس ہزار دینے کو تیار ہوں۔"

"اچھا۔" جلال بولے، "اگر یہ بات ہے تو وہ میز پر میری چیک بُک رکھی ہے۔ اٹھاؤ اور پچاس ہزار کا چیک لکھ دو۔ تم جیسے ہی چیک پر دستخط کرو گے، میں وہ خط تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

میں ہکا بکا رہ گیا اور انسپکٹر سراج پر تو یوں لگا جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ وہ کچھ دیر تک تو منھ کھولے ہونقوں کی طرح جلال کو اور مجھے دیکھتا رہا اور پھر بولا:

"اچھا یہ بات ہے تو لو میں چیک لکھے دیتا ہوں۔" پھر وہ میز کی طرف بڑھا، چیک بُک کھولی، جیب سے قلم نکالا اور پچاس ہزار کا چیک لکھ کر دستخط کر دیے۔"

جلال نے چیک کو غور سے دیکھا اور مسکرا کر میز کی دراز کھولی اور ایک خط نکال کر سراج کی طرف بڑھا دیا۔ سراج اس خط پر اس طرح جھپٹا جیسے چیل گوشت پر جھپٹتی ہے۔ جلدی سے لفافہ کھولا اور خط پر ایک نظر ڈالی پھر دوسرے لمحے میں وہ کمرے سے باہر تھا۔

انسپکٹر سراج کے چلے جانے کے بعد میں نے جلال سے پوچھا کہ یہ سب ڈراما کیا تھا اور اُسے یہ خط کہاں سے مل گیا۔

جلال نے کہا:

"بات یہ ہے کہ ہماری پولس بڑی ہوشیار بنتی ہے، لیکن ہے وہ لکیر کی فقیر۔ وہ ہمیشہ ایک ہی جیسے طریقے استعمال کرتی ہے تفتیش میں اور تلاش میں۔ چناں چہ جب مجھے سراج نے بتایا کہ کس طرح انھوں نے وزیر کے گھر اور دفتر کی تلاشی لی ہے تو میں سمجھ گیا کہ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ان کی تفتیش کے طریقے ٹھیک تھے اور تلاشی بھی انھوں نے ٹھیک طریقے سے لی، لیکن تفتیش کے یہ طریقے نہ اس کیس کے لیے موزوں تھے اور نہ اُس آدمی کے لیے جو اس قدر چالاکی سے سب کے سامنے سے خط لے اُڑا اور پھر اسے بلیک میلنگ کے لیے استعمال بھی کرتا رہا۔ سراج ایک ہوشیار آدمی ہے اور ایک اچھا پولس افسر مگر اس کا طریقہ ٹھیک نہیں۔ کبھی تو وہ بہت گہرائی میں چلا جاتا ہے اور کبھی محض سطح تک ہی رہتا ہے۔ اصل بات یہ سوچنے کی ہے کہ ہمارا مقابلہ جس شخص سے ہے اس کا ذہن کس طرح کام کر رہا ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب آپ اس کے ذہن میں بیٹھ کر سوچیں۔ سراج اور ان جیسے پولس افسر اسی لیے ٹھوکر کھاتے ہیں کہ وہ اپنے مدِمقابل سے اپنا ذہن نہیں ملا سکتے اور اس کی ذہانت کے بارے میں غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم سے زیادہ مجرموں کی چالوں کو کون سمجھے گا۔ جب کوئی چیز تلاش کرتے ہیں تو اپنے ہی انداز سے سوچتے ہیں۔ عام مجرموں سے تو وہ اس طرح نمٹ لیتے ہیں، لیکن اگر ان کا واسطہ کسی ہوشیار مجرم سے پڑ جائے تو پھر اُنھیں ہار ہی ماننا پڑتی ہے۔"

"ہاں مگر کچھ اصول تو ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں اصول تو ہیں اور سراج نے ان ہی اصولوں کے مطابق مکان کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا اور ایک ایک حصّے کی نہایت توجہ سے تلاشی لی۔ کرسی کے ہتھے اور پائے ٹھونک بجا کر دیکھے، مسہری کے گدے اُلٹ ڈالے، قالین اٹھا کر دیکھ لیا۔ یہ سب طریقے عام ہیں۔ عموماً لوگ اسی طرح اپنی چیزیں چھپاتے ہیں، لیکن اس معاملے میں اُن کا مقابلہ ایک نہایت ہوشیار، چالاک اور نڈر قسم کے آدمی سے تھا۔ اگر وہ عام مجرم ہوتا تو سراج کو خط ڈھونڈنے میں اتنی دشواری نہ ہوتی۔ وہ وزیر کو صرف شاعر سمجھتے رہے حال آں کہ وہ شاعر ہی نہیں ریاضی کا بھی ماہر ہے۔ اگر وہ صرف شاعر ہوتا تو سراج کو

مجھے یہ چیک دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اُس نے خط کو چھپانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ اس کی صلاحیتوں کے مطابق تھا۔ پھر وہ وزیرِ جنگ ہے اور سب ہی جانتے ہیں کہ دربار میں اس کا کیا اثر ہے۔ اُس کی سازشی طبیعت سے بھی لوگ واقف ہیں۔ کیا ایسے آدمی کو یہ نہیں پتا ہوگا کہ پولس خط کی تلاش میں کیا کرے گی۔ اُس کے مکان کی تلاشی بھی لی جائے گی۔ اُس پر حملہ بھی کیا جائے گا۔ وہ جو گھر سے رات رات بھر غائب رہا تو یہ بھی اس کی ایک چال تھی۔ وہ پولس کو تلاشی لینے کا پورا موقع دے رہا تھا تاکہ پولس اچھی طرح سمجھ لے کہ خط اس کے گھر میں نہیں ہے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا اور سراج اور اُس کے پولس افسروں کو یہ یقین ہو گیا کہ خط وزیر کے گھر میں نہیں ہے۔ وزیر صاحب پولس کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ میں نے جب پورے معاملے پر غور کیا تو بات سمجھ میں آگئی کہ وزیر نے خط ایسی جگہ رکھا ہوگا جہاں اُسے اندھا بھی دیکھ لے۔ ظاہر ہے ایک ہوشیار اور چالاک آدمی اگر اس خط کو استعمال کر رہا ہے تو وہ کہیں اُس کے سامنے ہی ہوگا۔ اس کے گھر کی اتنی احتیاط سے تلاشی کے بعد خط کا نہ ملنا اس بات کا اظہار تھا کہ وزیر صاحب نے چالاکی یہ چلی ہے کہ خط کو چھُپانے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔

"یہ سوچ کر میں نے رنگین چشمہ لگایا اور ایک دن صبح صبح وزیرِ جنگ کے گھر پہنچ گیا۔ وہ گھر پر ہی تھے اور ابھی سو کر اُٹھے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں اس طرف سے گزر رہا تھا تو ملنے چلا آیا۔ رنگین چشمے کا یہ بہانہ کیا کہ آنکھیں دُکھ رہی ہیں اور باتیں کرتے ہوئے رنگین شیشوں کے پیچھے سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے خاص طور پر ان کی لکھنے پڑھنے کی میز کی طرف توجہ کی جس کے قریب ہی وہ بیٹھے تھے۔ میز پر کچھ مختلف قسم کے خط اور کاغذ پڑے تھے، چند کتابیں دھری تھیں اور کچھ ایسی ہی چیزیں اور تھیں۔ کافی دیر تک جائزہ لینے کے بعد مجھے وہاں کوئی چیز ایسی نظر نہ آئی جس میں وہ خط رکھا جا سکتا ہو۔ کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے مجھے ایک خوب صورت سی ٹوکری نظر آئی جو آتش دان کے قریب ایک نیلے فیتے سے لٹک رہی تھی۔ اس ٹوکری میں ملاقاتیوں کے کچھ کارڈ پڑے

تھے اور ایک میلا کچیلا مڑا تڑا لفافہ پڑا ہُوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لفافے کو کھولنے کی کوشش کی گئی ہے مگر پھر بے کار سمجھ کر یوں ہی ڈال دیا گیا ہے۔ اس لفافے پر وزیرِ جنگ کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔

" اس خط پر نظر پڑتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ یہی وہ خط ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ لفافے کی ظاہری شکل اس خط سے مختلف تھی جو شاہی محل سے چُرایا گیا تھا۔ لفافے پر پتا بھی چھوٹے چھوٹے حروف میں لکھا تھا اور تحریر کسی عورت کی لگ رہی تھی، لیکن اس کا سائز وہی تھا جو سراج نے بتایا تھا۔ اس میلے کچیلے لفافے سے یہ یقین ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کسی بڑی شخصیت کی طرف سے آیا ہوگا۔ اس کا مقصد دھوکے میں ڈالنا تھا۔ دیکھنے والوں کا دھیان اُدھر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ ٹوکری بالکل سامنے لٹکی ہوئی تھی اور خط بھی سامنے ہی پڑا تھا۔ سراج کو کیسے شبہ ہو سکتا تھا۔

" میں نے اس ملاقات کو جتنی دیر جاری رکھ سکتا تھا، رکھا اور اس دوران میں نے پہلے کے لفافے کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔ میں وزیر صاحب سے سیاست پر باتیں کرتا رہا کیوں کہ اس میں ان کو بہت دل چسپی تھی۔ میں نے یہ بھی غور سے دیکھ لیا کہ لفافہ ٹوکری میں کس انداز سے رکھا ہوا ہے۔ میں نے دیکھا کہ لفافے کو الٹ کر دوبارہ بند کیا گیا ہے اور نیا پتا لکھ کر نئی مہر لگا دی گئی ہے۔ جب میں نے سب کچھ اچھی طرح دیکھ لیا تو وزیر صاحب سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ چلتے وقت اپنا سنہری سگرٹ لائٹر وہیں میز پر چھوڑ آیا۔

" اگلی صبح میں اپنا سگرٹ لائٹر لینے کے بہانے دوبارہ وزیر جنگ کے مکان پر گیا۔ بات چیت شروع کرتے ہوئے میں نے وہی کل کا قصّہ چھیڑ دیا جس سے انھیں بہت دل چسپی تھی۔ اچانک کمرے کی کھڑکی کے باہر زور سے پستول چلنے کی آواز آئی اور پھر کچھ عورتوں اور بچّوں کی خوف ناک چیخیں اور آوازیں آئیں۔ وزیر صاحب دوڑ کر کھڑکی کے پاس گئے اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگے۔ میں لپک کر ٹوکری کے پاس پہنچا اور وہ خط نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کی جگہ میں نے ایک ایسا

خط رکھ دیا جو بظاہر دیکھنے میں بالکل ویسا ہی تھا۔ یہ خط میں نے اپنے گھر بیٹھ کر تیار کیا تھا اور ویسی ہی تحریر اور مہر بنائی تھی۔

" مکان کے باہر گڑبڑ ایک شخص کی تھی جس نے عورتوں اور بچوں کے مجمع میں پستول چلا دیا تھا۔ پستول میں گولی بھی نہ تھی۔ ایک طاقت ور پٹاخہ تھا جس سے اتنی آواز پیدا ہوئی اور لوگ گھبرا کر چیخنے لگے۔ لوگوں نے اُس آدمی کو جو دراصل میرا ہی بھیجا ہُوا تھا پکڑ لیا، لیکن بعد میں دیوانہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اس سارے ہنگامے کو وزیر صاحب کھڑکی سے دیکھتے رہے پھر واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں بھی خط نکال کر ان کے پاس ہی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا تھا، ان کے ساتھ وہاں سے ہٹ آیا اور پھر اجازت لے کر چلا آیا۔"

" لیکن تم نے اس خط کی جگہ دوسرا خط ویسا ہی بنا کر کیوں رکھا۔ تم وہ خط اُٹھا کر لے آتے۔" میں نے پوچھا۔

" تمھیں معلوم نہیں وزیرِ جنگ بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ ہر کام کر سکتا ہے۔ اُس کے آدمی بھی ہر طرف لگے ہوئے ہیں۔ اگر میں ایسا کرتا جیسا کہ تم کہہ رہے ہو اور اُسے پتا چل جاتا کہ میں نے خط نکال لیا ہے تو میں وہاں سے زندہ بچ کر نہ آ سکتا تھا۔ لوگوں کو میری لاش کا بھی پتا نہ چلتا۔ پھر میرا ایک مقصد اور بھی تھا۔ میں اُس 'شخصیت' کے جو درحقیقت ملکہ عالیہ ہیں، حامیوں میں سے ہوں۔ وزیرِ جنگ جو اُن کا مخالف ہے کئی مہینوں سے ملکہ کو بلیک میل کر رہا تھا۔ اب اس خط کے اس کے قبضے سے نکل جانے کے بعد ملکہ اس کو قابو میں کر لیں گی۔ چوں کہ اُسے یہ تو پتا نہیں ہے کہ اصل خط غائب ہو چکا ہے لہٰذا وہ ملکہ پر پہلے کی طرح دباؤ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ ملکہ اس کو دھتا بتائیں گی اور وہ غصّے میں آ کر اُس خط کو جو میں نے ٹوکری میں رکھا ہے نکالے گا تاکہ بادشاہ کو جا کر پیش کر دے لیکن جب اسے کھولے گا تو اُس کی حالت دیکھنے کے قابل ہو گی۔"

" تم نے اس لفافے میں کچھ رکھ دیا ہے؟"

" ہاں۔ خالی لفافہ رکھ دینا تو کچھ اچھا نہ تھا۔ وزیرِ جنگ ایک بار مجھ پر بھی

وار کر چکا ہے اور میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ چناں چہ میں نے ایک پرچے پر یہ لکھ کر کہ 'جیسی کرنی ویسی بھرنی' اپنے دستخط کر دیے ہیں اور وہ میرے دستخطوں کو خوب پہچانتا ہے۔"

جیسی کرنی ویسی بھرنی

کچھ دنوں سے میرے دوست اور ملک کے مشہور سراغ رساں، جلال کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی انھیں کوئی بیماری تو نہ تھی بس کام کی زیادتی اور ذہنی دباؤ کا اُن کی صحت پر بُرا اثر پڑا تھا۔ ہمارے دوست ڈاکٹر احمد نے ایک دن فیصلہ دے دیا کہ جلال کو فوراً شہر سے باہر کسی پُر فضا مقام پر چلا جانا چاہیے اور کچھ دن سکون کے ساتھ وہاں گزارنے چاہییں۔ جلال پہلے تو ٹالتے رہے پھر ڈاکٹر احمد کے زور دینے پر تبدیل آب و ہوا کے لیے ازمیر سے کوئی ستر کلو میٹر دُور چشمہ چلے گئے۔ میں ان کے ساتھ تھا۔

یہ بہار کا موسم تھا۔ ہم نے ساحل پر ایک بنگلہ کرایہ پر لے لیا۔ یہ بڑی عجیب جگہ تھی۔ ہمارا بنگلہ ایک ٹیلے پر تھا جس کے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ سامنے خلیج تھی جس کے ایک جانب پہاڑی چٹانیں سمندر میں دُور تک نکلی ہوئی تھیں۔ ماضی میں نہ جانے کتنے بادبانی جہاز سمندری طوفانوں میں اِن چٹانوں سے ٹکرا کر ڈوبے ہوں گے اور کتنے ملاحوں کی جانیں ضائع ہوئی ہوں گی۔ جب شمال کی طرف سے ہوا چلتی تھی جہاز اسی خلیج میں آکر ان چٹانوں کے دامن میں پناہ لیتے تھے لیکن جب جنوب مغرب کی طرف سے ہوا اور بارش کا طوفان آتا تھا تو ان جہازوں کے لیے تباہی کا سامان لاتا تھا۔

خشکی کی طرف بھی ماحول ایسا ہی تھا۔ زیادہ تر علاقہ سُنسان تھا اور دُور تک

ایک میدان پھیلا ہوا تھا جس میں قدیم عمارتوں کے کھنڈر نظر آتے تھے۔ یہ علاقہ کسی زمانے میں بڑا مشہور تھا۔ یہاں بہت سی لڑائیاں بھی ہوئیں چناں چہ ٹوٹی ہوئی عمارتوں میں کچھ مقبرے اور کچھ خندقیں بھی شامل تھیں۔ یہاں ایک طرف سمندر اور دوسری طرف یہ خاموش اور ویران سا علاقہ میرے دوست کو بہت پسند آیا۔ یہ ان کی خاموش طبیعت کے مطابق تھا۔ وہ اکثر دُور تک سیر کو نکل جایا کرتے اور نہ جانے کیا سوچتے رہتے۔ پُرانی عمارتوں اور مقبروں پر قدیم زبان میں لکھی ہوئی عبارتیں بھی وہ شوق سے پڑھتے اور سمجھنے کے لیے انھوں نے کچھ کتابیں بھی منگوالی تھیں۔ غرض ماحول بڑا خاموش اور پرسکون تھا لیکن اس پُرسکون ماحول میں بھی ایسے واقعات رُونما ہو گئے کہ ہمارے یہاں آنے کا اصل مقصد کہ سکون و اطمینان سے کچھ دن گزاریں گے ختم ہو گیا۔

ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ جو میدان دُور تک پھیلا ہُوا تھا اُس میں پُرانی بستیوں کے آثار تھے، لیکن ایک بستی اب بھی آباد تھی۔ یہ ہمارے بنگلے سے کچھ فاصلے پر تھی۔ یہاں کوئی دو سو آدمی رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے مکان صاف سُتھرے خوب صورت ایک دوسرے سے تھوڑے سے فاصلے پر تھے اور بیچ میں ایک مسجد تھی۔ مسجد کے خطیب اور امام، حاجی توفیق مسجد کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے دومنزلہ مکان میں رہتے تھے۔ وہ اکیلے تھے۔ جلال کی طرح اُن کو بھی پُرانی اور تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کو دیکھنے اور ان کے بارے میں معلومات اکھٹی کرنے کا شوق تھا۔ اسی وجہ سے جلال اُن کے پاس اکثر آنے جانے لگے تھے۔ حاجی توفیق نے اپنے مکان کا حصّہ کرائے پر دے دیا تھا۔ اس میں جو صاحب رہتے تھے اُن کا نام انور بیگ تھا اور وہ ایک اچھے خوش حال آدمی تھے، لیکن امام صاحب اور ان کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔ امام صاحب صحت مند، خوش مزاج اور خوب بولنے والے تھے، لیکن اُن کا کرایہ دار دُبلا پتلا، چُپ چاپ رہنے والا شخص تھا۔ ایک دن ہم حاجی توفیق کے ہاں چائے پر گئے تو انھوں نے انور بیگ سے ہماری ملاقات کرائی۔ مجھے تعجب ہی ہوا کہ امام صاحب نے ایسے آدمی کو جس کا مزاج اُن سے اِس قدر مختلف ہے اپنے ساتھ کس طرح رکھ لیا ہے۔

ایک دن صبح کو جب میں اور جلال سیر کو نکلنے کی تیاری کر رہے تھے، امام صاحب

پریشان حال ہمارے بنگلے پر پہنچے۔ انور بیگ اُن کے ساتھ تھے۔

"جلال صاحب،" انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "رات ایک عجیب افسوس ناک واقعہ ہُوا ہے۔ آپ نے بھی ایسا واقعہ کبھی نہیں سُنا ہو گا۔"

"کیا ہُوا حاجی صاحب، آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں۔ اطمینان سے بیٹھیے پھر باتیں کریں گے۔" جلال نے اُنھیں اور انور بیگ کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں جو خاصے گھبرائے ہوئے تھے جلال کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"ہاں بتائیے کیا واقعہ ہُوا جس نے آپ دونوں کو اتنا بدحواس کر دیا۔" جلال نے پوچھا۔

حاجی توفیق بولے۔ "پہلے میں آپ کو بتا دوں پھر انور بیگ سے آپ پورا قصّہ سُنیے گا۔ انور بیگ کے دو بھائی اختر بیگ اور اصغر بیگ اور بہن راحیلہ خانم یہیں رہتے ہیں۔ کل شام یہ اُن ہی کے پاس گئے ہوئے تھے۔ رات دس بجے تک یہ وہاں رہے اور پھر میرے ہاں چلے آئے۔ جب یہ آئے ہیں تو وہ تینوں ٹھیک ٹھاک کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انور بیگ صبح کی سیر کے عادی ہیں۔ چناں چہ یہ سیر کرنے کے لیے اُسی طرف گئے۔ راستے میں ڈاکٹر جمال فواد ان کو مِلے۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ ان کے بھائی کے گھر جا رہے ہیں۔ وہاں شاید کسی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور انھیں بلایا گیا ہے۔ یہ بات سُن کر انور بیگ بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنے بھائی کے ہاں چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ان کے دونوں بھائی اور بہن کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بہن کا جسم ٹھنڈا پڑا تھا، اُس کی جان نِکل چکی تھی اور دونوں بھائیوں کی یہ حالت تھی کہ پاگلوں کی طرح کبھی قہقہے لگا رہے تھے اور کبھی گا رہے تھے۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھے۔ تینوں کے چہروں پر خوف اور دہشت کے آثار تھے۔ انور بیگ کے پوچھنے پر ان کی خادمہ آجر بی بی نے بتایا کہ وہ رات بھر گہری نیند سوتی رہی۔ اُس نے نہ کوئی شور سُنا اور نہ کسی کے چیخنے کی آواز۔ گھر میں سے کوئی چیز بھی چوری نہیں ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیا واقعہ ہو گیا جس سے ایک عورت مر گئی اور دو آدمی پاگل ہو گئے۔ جلال صاحب، آپ ایک ماہر سراغ رساں ہیں آپ ہی اس معاملے کو سمجھ سکیں گے، ہمیں آپ کی

مدد کی ضرورت ہے۔"

جلال نے پوری توجہ سے تمام واقعہ سُنا اور سوچ میں پڑ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہماری تفریح کے دن ختم ہو گئے۔ پھر وہ آہستہ سے بولے،

"یہ عجیب وغریب واقعہ ہے۔ میں اس کی تفتیش کروں گا۔"

پھر اُنھوں نے پوچھا:

"وہ مکان جہاں یہ واقعہ پیش آیا ہے کتنی دُور ہے؟"

"تقریباً ایک میل۔"

"اچھا تو ہم سب وہاں چلتے ہیں، لیکن اس سے پہلے انور بیگ صاحب، میں آپ سے چند سوال کرنا چاہوں گا۔"

انور بیگ اب تک خاموش تھے، لیکن پریشانی اور خوف ان کے چہرے سے ظاہر تھا۔ ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ بار بار ہاتھ مل رہے تھے۔

"ضرور پوچھیے، جلال صاحب، میں آپ کے تمام سوالوں کا صحیح صحیح جواب دوں گا۔"

"پہلے تو یہ واقعہ آپ مجھے تفصیل سے سنائیے۔"

"جیسا کہ امام صاحب نے بتایا، میں کل شام وہاں گیا تھا۔ رات کا کھانا بھی میں نے وہیں اپنی بہن اور بھائیوں کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے بعد ہم سب نشست کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے سوا دس بجے ان کو اللہ حافظ کہا اور انھیں خوش باخوش چھوڑ کر چلا آیا۔"

"آپ کے ساتھ دروازہ بند کرنے کون باہر آیا تھا؟"

"خادمہ جا چکی تھی۔ میں نے خود ہی دروازہ بند کیا۔ جس کمرے میں ہم سب بیٹھے تھے، اس کی کھڑکی بند تھی، لیکن چٹخنی نہیں لگی تھی۔ آج صبح جب میں نے دیکھا تو دروازہ اور کھڑکی ویسے ہی بند تھے۔ کسی اور بات سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ کوئی اندر آیا تھا۔ وہ تینوں وہیں بیٹھے تھے جہاں میں انھیں بیٹھا چھوڑ کر آیا تھا۔ میری بہن مر چکی تھی اور دونوں بھائی عقل کھو چکے تھے۔ میں نے جو منظر دیکھا ہے، وہ میں

زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔"

"ہاں واقعی یہ حیرت کی بات ہے۔ کیا اس کی کوئی وجہ آپ کے خیال میں آتی ہے؟"

"جلال صاحب، یہ شیطانی حرکت ہے، شیطانی حرکت!" انور بیگ نے جوش میں آکر کہا، "یہ کسی انسان کی حرکت نہیں۔"

جلال نے کہا، "اگر یہ کسی انسان کی حرکت نہیں تو میری سمجھ سے بھی باہر ہوگی، لیکن پہلے ہمیں حالات کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے۔ انور بیگ صاحب آپ اپنے خاندان سے الگ کیوں رہتے ہیں؟ وہ تینوں بہن بھائی ایک جگہ رہتے ہیں اور آپ نے الگ گھر لیا ہُوا ہے۔"

"جلال صاحب، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں ایک ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا کیوں کہ ہمیں ایک دوسرے سے جو شکایتیں تھیں وہ کب کی دُور ہو چکی ہیں۔ ہمارے باپ کی کوئلے کی کانیں تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد ہم یہ کام نہیں کر سکے اور ہم نے تمام کانیں ایک کمپنی کے ہاتھ بیچ دیں اور اس سے جو رقم ملی اُسے لے کر ہم یہاں رہنے کے لیے آ گئے۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ رقم کی تقسیم پر ہمارے درمیان جھگڑا ہوا تھا، لیکن وہ بات مدت ہوئی ختم ہو گئی اور صلح صفائی کے بعد پھر ایک ہو گئے۔ اب ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے اور ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں۔"

"کل شام کے واقعات یاد کیجیے۔ شاید کوئی بات، کوئی غیر معمولی واقعہ یاد آجائے جس سے اس سانحے پر روشنی پڑتی ہو۔" جلال نے کہا۔

"نہیں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔"

"کیا وہ تینوں خوش تھے؟"

"جی بہت خوش۔"

"کیا وہ ڈرپوک تو نہیں تھے۔ انھیں کوئی خطرہ تو نہیں تھا؟"

"نہیں کوئی نہیں۔"

"تو آپ کوئی ایسی بات نہیں بتا سکتے جو اس تفتیش میں مدد دے سکے۔"

انور بیگ سوچ میں پڑ گئے ، پھر بولے :

"ہاں، ایک بات مجھے یاد آئی۔ جب میں کمرے میں بیٹھا ہُوا تھا تو میری پیٹھ کھڑکی کی طرف تھی۔ میرا بھائی اختر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اُسے کھڑکی کی جانب گھورتے ہوئے دیکھا۔ چناں چہ میں نے بھی گردن پھیر کر اُس طرف دیکھا۔ کھڑکی بند تھی۔ باغیچے میں لان کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے مجھے کوئی چیز ان جھاڑیوں میں حرکت کرتی نظر آئی۔ مجھے یہ اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ کوئی جانور تھا یا انسان۔"

"آپ نے باہر جاکر نہیں دیکھا؟"

"نہیں اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔"

"آپ جب وہاں سے چلے تھے تو وہ تینوں ٹھیک ٹھاک تھے؟"

"جی ہاں۔"

"انور بیگ صاحب، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کو اتنے سویرے اس واقعے کی اطلاع کیسے مِل گئی۔"

"بات یہ ہے کہ میں صبح سویرے اُٹھنے کا عادی ہوں اور ناشتے سے پہلے سیر کو جاتا ہوں۔ معمول کے مطابق آج بھی میں صبح سیر کو جا رہا تھا کہ پیچھے سے ڈاکٹر جمال فواد کی گاڑی آئی۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے گاڑی روک لی اور بتایا کہ وہ میرے بھائیوں کے گھر ہی جا رہے ہیں جہاں کسی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اِس سے پریشان ہو گیا کیوں کہ میں تو ان سب کو رات اچھا بھلا چھوڑ کر آیا تھا۔ چناں چہ میں بھی حال معلوم کرنے کے لیے ڈاکٹر فواد کے ساتھ چل پڑا۔ گھر پہنچ کر جو منظر دیکھا اُس نے تو میرے حواس کھو دیے۔ راحیلہ کرسی کے ایک بازو پر گردن ڈالے پڑی تھی۔ اُس کی موت کو چھے گھنٹے ہو چکے تھے۔ میرے دونوں بھائی بندروں کی طرح کود پھاند رہے تھے اور کچھ گاتے جا رہے تھے۔ دونوں کے چہروں سے وحشت برس رہی تھی۔ جلال صاحب، اپنی بہن کو مردہ اور بھائیوں کو پاگل دیکھ کر آپ خود سوچ سکتے ہیں، میرا کیا حال ہوا ہو گا۔ ڈاکٹر فواد کے چہرے کا بھی رنگ

اُڑ گیا اور وہ کرسی پر گِر گئے۔"

"بڑی ہی عجیب بات ہے۔" جلال نے کہا اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولا، "ایسا واقعہ اس سے پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزرا۔ چلیے میں اِسی وقت آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

۲

ڈاکٹر فواد کی ہدایت پر انور بیگ کے بھائیوں کو جو بالکل پاگل ہو چکے تھے۔ دماغی ہسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ ان کی شکلیں واقعی دیکھی نہ جاتی تھیں۔ چہروں پر ایسی خوف ناک دحشت تھی کہ دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ ہم جب اُن کے گھر پہنچے ہیں تو اسی وقت پاگل خانے کی گاڑی اُنھیں لے کر روانہ ہو رہی تھی۔

وہ مکان جس میں یہ حادثہ پیش آیا ایک وسیع اور کشادہ مکان تھا۔ اس کے خوب صورت باغ میں موسمِ بہار کے پھول کِھلے ہوئے تھے اور اس کے چاروں طرف جنگلی پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ اس باغ کی طرف گول کمرے کی وہ کھڑکی کھُلتی تھی جس کے بارے میں انور بیگ کا خیال تھا کہ کوئی شیطانی روح اس کے ذریعہ سے اندر داخل ہوئی تھی۔

مکان کے اندر جانے سے پہلے جلال نے باغ کا جائزہ لیا۔ وہ پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو۔ شاید بے خیالی میں اُس کا پاؤں پانی کی بالٹی سے ٹکرایا اور پانی زمین پر گِر کر روش پر پھیل گیا۔ ہم سب کے جوتے بھیگ گئے۔ مکان کے اندر گئے تو انور بیگ کے بھاتیوں کی خادمہ آجر بی بی سے ملاقات ہوئی۔ جلال نے اُس سے کئی سوال کیے۔ اس نے بتایا کہ "رات کو راحیلہ خانم اور اُن کے بھائی بالکل ٹھیک تھے۔ وہ تینوں گول کمرے میں ہنس بول رہے تھے۔ میں اس کے بعد چلی گئی۔ صبح جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو ایک عجیب بھیانک منظر تھا۔ میں تو تقریباً بے ہوش ہو گئی۔ پھر جب میرے حواس کچھ درست ہوئے تو میں نے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں اور جلدی سے ڈاکٹر فواد کو اطلاع کروائی۔ میں نے تو ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔"

پھر وہ راحیلہ کو یاد کر کے رونے لگی۔

پھر ہم اوپر کی منزل پر گئے۔ راحیلہ کی لاش کو دیکھا۔ وہ اپنی جوانی میں بہت خوب صورت ہو گی۔ اب ادھیڑ عمر میں بھی وہ حسین تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی خوف اور دہشت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ سونے کے کمرے سے ہم لوگ گول کمرے میں آئے جہاں رات کو یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

جلال نے آجر بی بی سے پوچھا کہ کیا اس کمرے میں کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹائی گئی ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہر چیز جیسی رات تھی ویسی ہی رکھی ہے۔ جلال نے کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنا شروع کیا۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے باری باری ہر کرسی پر بیٹھا کہ کرسیوں پر سے باغ کا کتنا حصہ نظر آ سکتا ہے۔ اس نے فرش اور چھت کا بھی پوری توجہ سے جائزہ لیا۔ پھر وہ اس لیمپ کے پاس گیا جو کھڑکی کے قریب میز پر رکھا تھا اور غور سے اس کو دیکھا۔ یکایک اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی جو اس بات کی نشانی تھی کہ اُسے کوئی سراغ مل گیا ہے۔

پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولا، آؤ چلیں۔ یہاں اب کچھ دیکھنے کے لیے نہیں ہے"۔

"مگر آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ یہ سب کیسے ہوا ہے؟" انور بیگ نے جلدی سے کہا۔

"یہ واقعہ بڑا انوکھا ہے۔ میں اس پر غور کروں گا اور اگر کوئی بات سمجھ میں آئی تو آپ کو بتاوں گا۔ فی الحال میں آپ سب سے اجازت چاہتا ہوں"۔

اپنے بنگلے پر واپس آنے کے بعد جلال کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ وہ کسی خاص بات پر غور کر رہا تھا۔ اُس کی عادت میں جانتا تھا کہ جب وہ کسی گہری سوچ میں ہوتا ہے تو چپ ہو جاتا ہے۔ چناں چہ میں بھی اُسی کی طرح صوفے پر خاموش بیٹھا اخبار دیکھتا رہا۔ پھر وہ اچانک کھڑا ہو گیا اور بولا،

"آؤ، باہر چلیں۔ شاید سمندر کی تازہ ہوا ہمارے دماغ کو تیز کر دے اور جو باتیں اب تک سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں، وہ سمجھ میں آنے لگیں"۔

میرے لیے اس سے بہتر اور کوئی تجویز نہ ہو سکتی تھی۔ صبح کے واقعے کا میرے

دل پر بھی بہت اثر تھا۔ پاگل بھائیوں کی صورتیں بُھلائے نہیں بھول رہی تھیں۔ کیسی وحشت تھی ان کے چہروں پر اور راحیلہ کے معصوم چہرے پر کیسا خوف تھا۔

ہم سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ جلال کہنے لگا: "انور بیگ اپنی بہن کی موت اور اپنے بھائیوں کی دیوانگی کو شیطان کی کارستانی بتا رہا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ شیطان کی نہیں انسان کی کارستانی ہے۔ اگر ہم انور بیگ کے بیان کو صحیح مان لیں تو یہ واقعہ اُس کے اپنے بھائیوں کے گھر سے آنے کے فوراً بعد رُونما ہُوا۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ وہ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے پائے گئے ورنہ اتنی رات گزرنے کے بعد انھیں اپنے بستروں پر ہونا چاہیے تھا۔ تمھیں یاد ہوگا کہ میری ٹھوکر سے باغ میں پانی کی بالٹی اُلٹ گئی تھی۔ وہ میں نے جان کر گرائی تھی تاکہ پانی سے زمین گیلی ہوجائے اور انور بیگ کے پاؤں کے نشان بن جائیں میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ ان لوگوں سے رخصت ہونے کے بعد کدھر گیا۔ مجھے اطمینان ہوگیا کہ وہ یہاں سے نکل کر اپنے گھر کی طرف گیا تھا۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ موقع پر موجود نہ تھا تو کون تھا جس نے راحیلہ کی جان لی اور بھائیوں کو پاگل بنا دیا۔ آجر بی بی ہو نہیں سکتی تھی۔ کھڑکی کے پاس کسی اور آدمی کی موجودگی کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ انور بیگ کہتا ہے کہ اُس نے جھاڑیوں میں کسی چیز کو حرکت کرتے دیکھا تھا، لیکن جھاڑیوں کے آس پاس ایسا کوئی نشان نہیں ہے۔ جس سے کسی آدمی یا جانور کی موجودگی کا پتا چلتا ہو حال آں کہ بارش کی وجہ سے زمین گیلی تھی۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی اجنبی ان لوگوں کو اتنا خوف زدہ کس طرح کر سکتا ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن میرا خیال تھا کہ تمھیں کمرے میں کوئی سراغ مل گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ایک دو باتیں میں نے نوٹ کی ہیں، لیکن مجھے ابھی مزید ثبوت چاہیے۔" اس نے کہا اور پھر وہ سمندر کے کنارے ایک ٹیلے پر بنی ہوئی قبروں کے کتبے پڑھنے میں لگ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب اس واقعے کے بارے میں مزید کوئی گفت گو نہ ہوگی۔

ہم اسی طرح پہاڑیوں پر گھومتے پھرتے تیسرے پہر کو اپنے بنگلے پر واپس پہنچے۔

وہاں ایک شخص ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ لمبے قد اور مضبوط جسم کے اس آدمی کو جس کے چہرے پر گھنی داڑھی اور سر پر گھونگھر والے بال تھے، پہچاننا کچھ مشکل نہ تھا۔ یہ ڈاکٹر مراد عثمان تھے جنھیں جڑی بوٹیوں کے ماہر کی حیثیت سے ایک دنیا جانتی تھی۔ وہ ایک مدت سے افریقہ کے جنگلوں میں تحقیق کر رہے تھے۔ ہمیں یہ معلوم تھا کہ وہ ان دِنوں ازمیر آئے ہوئے ہیں، لیکن یہ پتا نہ تھا کہ وہ یہاں چشمے میں موجود ہیں انھیں اپنی نشست گاہ میں بیٹھے دیکھ کر ہم دونوں کو بہت تعجب ہوا کیوں کہ وہ ہر وقت اپنے مطالعے اور تحقیق میں مشغول رہتے تھے اور کہیں آتے جاتے نہ تھے۔ جلال نے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ مِلایا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ڈاکٹر مراد بول اُٹھے:

"مجھے دیکھ کر آپ کو یقیناً تعجب ہوا ہوگا اور پھر جس معاملے میں میں آپ سے گفت گو کرنے آیا ہوں اس سے تو آپ اور بھی حیران ہوں گے۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ یہاں کی پولس نہایت ناکارہ ہے اور وہ اس سانحے کی صحیح تحقیقات نہیں کر سکے گی جو رات ندیمان کی بستی میں پیش آیا ہے۔ آپ کے کارناموں کا ذکر میں نے بہت سُنا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس معمے کو حل کر سکیں گے۔"

جلال نے اپنے مہمان پر گہری نظر ڈالی اور بولا: "ڈاکٹر مراد اس میں آپ کی دل چسپی میرے لیے واقعی حیرت کا باعث ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟"

"جلال صاحب، میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ یہاں گزارا ہے۔ میں اس بدنصیب خاندان سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہوں بلکہ ان سے میری ننہالی رشتہ داری بھی ہے۔ مجھے اس واقعے سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ میں تو افریقہ واپس جا رہا تھا، لیکن جب مجھے اس کی اطلاع ملی تو ازمیر کی بندرگاہ سے واپس آگیا تاکہ تحقیقات میں مدد دے سکوں۔"

"تو کیا آپ کا جہاز چھوٹ گیا؟" جلال نے پوچھا۔

"ہاں۔ اب میں دوسرے جہاز سے جاؤں گا۔" ڈاکٹر مراد عثمان نے جواب دیا۔

"آپ نے واقعی دوستی کا حق ادا کر دیا۔" جلال نے کہا۔

"دوست ہی نہیں۔ وہ میرے عزیز بھی ہیں۔" ڈاکٹر مراد نے جواب دیا

"لیکن آپ کو اِس سانحے کی اطلاع کیسے ملی۔ اخباروں میں تو یہ خبر چھپی نہیں

ہو گی ؟" جلال نے پوچھا۔
"مجھے ایک تار ملا تھا۔" انھوں نے جواب دیا۔
"کیا میں پوچھ سکتا ہوں تار کِس کا تھا ؟"
"آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔"
"جی۔ یہ میرا پیشہ ہے۔"
"اچھا۔ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں، مجھے یہ تار حاجی توفیق نے بھیجا تھا۔"
"شکریہ، جہاں تک اس سانحے کا تعلق ہے تو پولس تحقیقات کر رہی ہے۔ میں نے موقع پر جاکر جائزہ لیا ہے۔ میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں، لیکن مجھے امید ہے کہ بہت جلد یہ معمہ حل کر لوں گا۔ اس سے زیادہ اس وقت کچھ اور کہنا بے کار ہے۔"
"کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کا شبہ کِس پر ہے؟" ڈاکٹر مراد عثمان نے سوال کیا۔
"میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔" جلال نے کہا۔
"اچھا تو پھر اب میرا یہاں بیٹھنا بے کار ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر مراد عثمان اللہ حافظ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے۔
اُن کو گئے مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ جلال بھی باہر نکل گیا۔ مجھے کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کیوں۔ شام کے قریب وہ واپس آیا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ جس مشن پر گیا تھا، اُس میں کام یاب نہیں ہوا۔ واپس آتے ہی اُس نے وہ تار پڑھا جو اُس کی غیر حاضری میں آیا تھا اور پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور مجھ سے بولا:
"یہ تار ازمیر کے اس ہوٹل سے آیا ہے جہاں ڈاکٹر مراد ٹھیرے ہوئے ہیں۔ ہوٹل والوں نے ان کے بیان کی تصدیق کی ہے۔ وہ واقعی رات اسی ہوٹل میں تھے اور آج صبح کسی وقت جہاز سے افریقہ جانے والے تھے بلکہ اُن کا کچھ سامان تو بندرگاہ بھی چلا گیا تھا۔"
"ڈاکٹر مراد کو اس معاملے سے گہری دل چسپی معلوم ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ خاص دِل چسپی۔ اس سے تحقیقات میں ایک نیا موڑ پیدا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی اور واقعہ رونما ہو جائے جس سے اس معمے کے حل کرنے میں مدد ملے۔"
مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ جلال کی بات اتنی جلدی سچ ثابت ہو جائے گی اور ایک ایسا واقعہ رونما ہو جائے گا جس سے اس معمے کو حل کرنا آسان ہو جائے گا۔ دوسرے دن صبح صبح میں شیو کر رہا تھا کہ دروازے پر ایک گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو حاجی توفیق گاڑی سے اتر کر تیزی کے ساتھ بنگلے کے اندر آرہے تھے۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اُسی وقت جلال بھی کپڑے تبدیل کر کے اپنے کمرے سے باہر آرہا تھا۔ حاجی توفیق سخت بدحواس ہو رہے تھے۔ انھوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا، "جلال صاحب، ہماری بستی میں آسیب آ گئے ہیں یا شیطان نے قبضہ کر لیا ہے۔"
"کیا ہوا، حاجی صاحب، آپ ذرا اطمینان سے بیٹھیے تو۔" جلال نے ان کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔
امام صاحب نے اپنی ٹوپی سر پر ٹھیک سے جمائی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے:
"عجیب قصّہ ہے۔ انور بیگ اسی طرح مردہ پائے گئے ہیں جس طرح ان کی بہن مری ہیں۔"
"اچھا۔" جلال نے ایسے کہا جیسے اُسے پہلے سے یقین ہو کہ ایسا ہونے والا ہے۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اور مجھ سے کہنے لگا، "جلدی سے کپڑے پہن لو۔ ہم ابھی فوراً حاجی صاحب کے ساتھ چلتے ہیں۔ ایک منٹ بھی ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔"
انور بیگ حاجی توفیق کے مکان کے پچھلے حصّے میں رہتے تھے۔ اس میں دو کمرے تھے ایک نیچے اور دوسرا اوپر۔ نیچے ڈرائنگ روم تھا اور اوپر بیڈروم۔ ڈرائنگ روم کے سامنے ایک کشادہ باغ تھا جو کمرے کے دروازے تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم پولس اور ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے اور انور بیگ کے کمرے میں کوئی چیز بھی گڑبڑ نہیں ہونے پائی تھی۔ ہم جب کمرے میں داخل ہوئے تو فضا میں ایک عجیب سی گھٹن تھی حال آں کہ نوکر نے پہلے ہی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ ایک طرف

میز پر رکھا ہوا لیمپ ابھی تک جل رہا تھا اور اس میں سے ہلکا ہلکا سا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی صوفے پر انور بیگ مرا پڑا تھا۔ اس کا مُنہ کھڑکی کی طرف تھا اور اس کے چہرے پر شدید خوف اور تکلیف کے آثار تھے بالکل ویسے ہی جیسے راحیلہ کے چہرے پر مجھے دکھائی دیے تھے۔ اس کا سارا بدن اکڑ ہوا تھا اور اُنگلیاں اینٹھی ہوئی تھیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے سخت تکلیف اور خوف کی حالت میں جان دی ہے۔

اتنی دیر میں پولس بھی وہاں پہنچ گئی اور اس نے حاجی توفیق اور انور بیگ کے ملازم سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ڈاکٹر بھی آگیا تھا اور وہ انور بیگ کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ جلال نے مجھ سے کہا،

"چلو دوست، اب یہاں ہمارا کوئی کام نہیں۔ مجھے جو کچھ دیکھنا تھا میں نے دیکھ لیا۔" پھر وہ حاجی توفیق سے بولا، "پولس افسر سے کہنا کہ وہ ذرا لیمپ کا اچھی طرح معائنہ کرے اس سے تفتیش میں مدد ملے گی۔"

۳

پولس کی تفتیش کے بارے میں دو دن تک ہمیں کچھ پتا نہ چلا۔ اس دوران جلال زیادہ تر خاموش کچھ سوچتا رہا۔ وہ ٹہلنے کے لیے اکیلا نکل جاتا اور گھنٹوں بعد واپس آتا لیکن یہ نہ بتاتا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ دوسرے دن وہ ایک بالکل ویسا ہی لیمپ خرید کر لایا جیسا انور بیگ کے کمرے میں تھا اور جو میں نے اس سے پہلے اس کے بھائیوں کے کمرے میں رکھا دیکھا تھا۔ پھر اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولا:

"آؤ ایک تجربہ کرتے ہیں، لیکن یہ یاد رہے کہ یہ تجربہ خطرناک ہے اور اگر تم ذرا بھی بے چینی محسوس کرو تو کہہ دینا ہم فوراً کمرے سے باہر نکل جائیں گے۔"

اس نے مجھے اپنے سامنے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ برابر میں میز پر لیمپ رکھ دیا اور اسے روشن کر دیا پھر اُس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی پڑیا نکالی اور اس میں سے ذرا سا سفوف لے کر بلب پر چھڑکا جو اَب تک خوب گرم ہو چکا تھا۔ یکایک ایک ہلکا سا دھواں اُٹھا اور مجھے یوں لگا جیسے میں اگر ایک لمحے اور اس کمرے میں رہا تو دَم گھٹ کر مر جاؤں گا۔ کمرہ بند نہ تھا اور کھڑکیاں بھی کُھلی تھیں، لیکن سفوف کے جلنے سے فضا میں زہریلا دھواں پھیلا کہ چند سیکنڈ بھی سانس لینا دشوار ہو گیا۔ ہم دونوں اُٹھ کر تیزی سے باہر بھاگے اور باغ کے سبزہ زار پر لیٹ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس تجربے کا مقصد کیا تھا انور بیگ اور اس کی بہن کی موت کیسے واقع ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد جب ہم واپس کمرے میں آئے تو میں نے جلال سے پوچھا کہ اسا زہریلے سفوف کا اس نے کس طرح پتا چلایا۔ وہ کہنے لگا:

"تمھیں یاد ہو گا کہ ہم نے انور بیگ کے بھائیوں کے کمرے میں داخل ہوتے

ہی فضا میں ایک عجیب سی گھٹن محسوس کی تھی اور یہی کیفیت اس وقت تھی جب ہم
انور بیگ کے مرنے کے بعد اس کے کمرے میں گئے تھے۔ ہم سے پہلے بھی جو اس
کمرے میں گیا اس پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر فواد بھی کمرے میں داخل
ہوتے ہی کرسی پر گر گئے تھے۔ آجر بی بی نے بھی یہی بیان دیا تھا کہ کمرے میں داخل
ہوتے ہی اُس کا دم گھٹنے لگا تھا اور اس نے تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ انور بیگ
کے کمرے میں داخل ہونے والا ملازم تو اب تک بیمار پڑا ہے۔ ان تمام باتوں
سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی طریقے سے کمروں کی فضا کو زہر آلود کیا گیا ہے۔
دونوں کمروں میں ایسے لیمپ کی موجودگی جس پر کوئی شیڈ نہیں ہے معنی خیز تھی۔
چناں چہ میں نے اسی طرف توجہ دی۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ کوئی چیز لیمپ کے
روشن بلب پر ڈالی گئی ہے۔ اور اس کی گرمی سے جل کر اس نے کمرے کی فضا کو زہر آلود
کر دیا ہے۔ یہ زہر اتنا تیز ہے کہ اس میں سانس لینے والا مشکل ہی سے زندہ بچ سکتا
ہے۔ انور بیگ کے بھائیوں کے کمرے میں جو لیمپ روشن تھا وہ شاید فوراً ہی بجھ
گیا تھا ورنہ راحیلہ کی طرح اختر اور اصغر بھی مر چکے ہوتے۔ راحیلہ ایک نازک عورت
تھی۔ وہ زہریلے دھوئیں کی لمحہ بھر کے لیے بھی تاب نہ لا سکی اور مر گئی۔ دونوں مرد
لیمپ کے فوراً ہی بجھ جانے سے بچ تو گئے، لیکن زہر کے اثر سے اپنے حواس
کھو بیٹھے۔ انور بیگ کا لیمپ جلتا رہا اور کھڑکی بند رہی اس لیے وہ زندہ نہ بچ
سکا۔ میں نے انور بیگ کے بھائیوں کے کمرے میں لیمپ کے بلب کو جب قریب سے
دیکھا تو مجھے اُس پر بھورے سے ذرات نظر آئے تھے اور اسی وقت مجھے شبہ ہو گیا تھا۔
اب اس وقت کے تجربے نے تو کوئی شک ہی باقی نہیں رکھا ہے۔"

"مگر یہ سفوف کس نے ڈالا تھا۔ کون ان لوگوں کی جان کا دشمن تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ حرکت انور بیگ کی تھی۔ گو وہ خود بھی اسی کا شکار ہو گیا۔ تمھیں معلوم ہے
کہ انور بیگ کا اپنے بھائیوں سے جائداد کی تقسیم پر جھگڑا تھا۔ گو بعد میں وہ آپس میں
پھر ملنے لگے تھے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ انور بیگ کا دل ان کی طرف سے صاف نہیں
ہوا تھا۔ وہ ایک کینہ پرور آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ پرخلوص آدمی

آدمی نہیں ہے۔ پھر اس نے یہ کہہ کر کہ کمرے میں بیٹھے ہوئے اُس نے کسی کو جھاڑیوں
میں حرکت کرتے دیکھا تھا، مجھے غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں
کے گھر سے آخر میں نکلا تھا۔ چلتے وقت اگر اس نے لیمپ پر سفوف نہیں چھڑکا تو پھر اور
کون تھا جو یہ حرکت کر گیا اور کمرے میں بیٹھے تین آدمی اسے نہیں دیکھ سکے۔"

"تو گویا اس نے اپنی حرکت پر شرمندہ ہو کر خودکشی کر لی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی ممکن ہے۔ اتنا بڑا جرم کرنے پر اس کا ضمیر تو ملامت کر ہی رہا ہو گا۔
لیکن میرا خیال ہے اُس نے خودکشی نہیں کی۔ بہر حال ایک شخص جو ان تمام باتوں
سے واقف ہے یہاں آنے ہی والا ہے، ہم اُس سے سُنیں گے کہ اصل واقعہ کیا ہے۔
لو وہ آ بھی گیا!"

اسی لمحے دروازے پر کھٹکا ہوا جلال نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے مشہور
ماہر نباتات، ڈاکٹر مراد عثمان کھڑے تھے۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔" جلال نے کہا۔

"ہاں آپ نے بلایا تھا۔ میں آ گیا ہوں۔ کہیے کیا بات ہے؟"

"میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ افریقہ جانے سے پہلے آپ اس معمے کو حل
کرتے جائیں۔ بہت سی باتیں تو میری سمجھ میں آ گئی ہیں، لیکن ایک دو باتیں ایسی ہیں جو
میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

ڈاکٹر مراد عثمان نے بے چینی سے پہلو بدلا اور کہنے لگے:

"کیا بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟"

"انور بیگ کا قتل۔"

"انور بیگ کے قتل کا مجھ سے کیا تعلق؟ مجھ سے آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔"
ڈاکٹر نے کچھ ناراضگی سے کہا اور اُٹھ کر جانے لگے۔

جلال نے اُنھیں ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا اور کہنے لگا:

"ڈاکٹر مراد، آپ ایک مشہور سائنس داں ہیں۔ آپ یقیناً یہ نہیں چاہیں گے کہ پولس
آپ سے وہ سوال کرے جو میں نے کیا ہے۔"

ڈاکٹر مراد عثمان خاموش بیٹھ گئے۔ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے کچھ دیر سوچتے رہے۔ اُن کے چہرے پر رنج کے آثار تھے۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگے:

"جلال صاحب، میں آپ کو کیا بتاؤں، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے لیے یہ ایک بڑا سانحہ ہے۔"

"نہیں، ڈاکٹر مراد، اس سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے آپ کی پوری نگرانی کی ہے۔ آپ کل رات بھر جاگتے اور بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ پھر پو پھٹتے ہی گھر سے نکلے۔ جیب میں وہ بھورا سفوف رکھا جس کے ذرّات آپ کے سامنے والے گیٹ پر شاید اب تک لگے ہوں۔"

ڈاکٹر مراد چونک اُٹھے۔ آپ میرا تعاقب کر رہے تھے؟ مگر میں نے تو آپ کو نہیں دیکھا۔"

"آپ مجھے کیسے دیکھتے۔ تعاقب تو چھُپ کر ہی کیا جاتا ہے۔" جلال نے جواب دیا۔ پھر وہ کہنے لگا، "خیر گھر سے نکل کر آپ مسجد تک گئے اور ایک لمحے وہاں رُک کر آگے نکل گئے۔ اس وقت آپ ٹینس کا یہی جوتا پہنے ہوئے تھے جو اس وقت پہنے ہوئے ہیں۔ آپ پھر کچھ دیر بعد واپس آئے۔ باغ میں سے ہوتے ہوئے انور بیگ کے کمرے کی کھڑکی تک پہنچے۔ اب اُجالا ہو گیا تھا، لیکن مکان میں خاموشی تھی۔ آپ وہاں کھڑے تھے کہ انور بیگ نے اوپر کی کھڑکی سے آپ کو دیکھا، آپ نے اسے اشارے سے بلایا۔ وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آیا۔ آپ اندر گئے کچھ دیر باتیں ہوئیں، پھر آپ باہر نکل آئے اور کھڑکی بند کر دی اور اُس کے سامنے کھڑے کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ بتائیے، کیا یہ سچ نہیں ہے؟"

ڈاکٹر مراد عثمان کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنھ چھُپالیا، پھر اپنی جیب میں سے ایک تصویر نکالی اور جلال کو دیتے ہوئے کہنے لگے:

"جلال صاحب، میں نے جو کچھ کیا اس کی خاطر کیا۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔"

یہ تصویر راحیلہ کی تھی جو اس کی جوانی کے دِنوں میں کھینچی ہو گی۔ اس میں وہ انتہائی خوب صورت لگ رہی تھی۔

ڈاکٹر مراد عثمان نے پھر اپنی سُنانی شروع کی۔

"یہیں چشمے میں راحیلہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبّت کرنے لگے تھے، لیکن میں اُس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ میری بیوی تھی گو اُس نے مجھے مدّت سے چھوڑ رکھا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے ملتے رہتے۔ جب بھی اپنی تحقیقات سے فارغ ہوتا یہاں اُس سے ملنے آجاتا۔ حاجی توفیق ہمارے رازدار تھے۔ ان سے پوچھ لیجیے ہماری دوستی کتنی پاکیزہ تھی۔ راحیلہ فرشتہ صفت عورت تھی۔ میں کچھ دِنوں کے لیے افریقہ سے واپس آیا تھا اور جس دن جانے والا تھا مجھے یہ غم ناک خبر مِلی کہ وہ اچانک مر گئی اور اس کے بھائی پاگل ہو گئے۔ چناں چہ میں بندرگاہ سے واپس لوٹ آیا۔ آپ میرے دُکھ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ انور بیگ کا اپنے بھائیوں اور بہن سے جائداد پر جھگڑا ہے۔ یہ لوگ بعد میں ایک دوسرے سے مِلنے لگے تھے، لیکن انور بیگ بہت بُری طبیعت کا آدمی تھا اور وہ ان تینوں سے دل ہی دل میں نفرت کرتا تھا۔ دو ہفتے ہوئے وہ میرے مکان پر آیا۔ باتوں کے دوران میں نے اس کو افریقہ کے جنگلوں میں پائی جانے والی عجیب و غریب جڑی بوٹیوں کے بارے میں بتایا۔ اسی سلسلے میں، میں نے اس کو ایک سفوف دکھایا جو ایک ایسی بوٹی سے حاصل کیا جاتا ہے جو سخت زہریلی ہوتی ہے۔ مغربی افریقہ کے کچھ علاقوں میں اس کو دوا کے طور پر استعمال کرتے ہیں، لیکن یورپ میں ابھی اس سے لوگ بالکل ناواقف ہیں۔ اس پر تحقیق کے دوران مجھے معلوم ہُوا کہ اس کا دھواں انسان کے ذہن کو گلا دیتا ہے۔ پہلے آدمی پاگل ہو جاتا ہے اور پھر ذرا سی دیر میں مر جاتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح انور بیگ نے اس میں سے تھوڑا سا سفوف چُرا لیا۔ جب حاجی توفیق کے تار سے مجھے یہ معلوم ہُوا کہ راحیلہ اچانک مر گئی اور اُس کے دونوں بھائی پاگل ہو گئے ہیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ اسی سفوف کا اثر ہے اور انور بیگ نے اسے اپنے بھائیوں اور بہن کو ٹھکانے لگا کر پوری جائداد پر قبضہ کر لینے کے لیے استعمال کیا ہے۔ چناں چہ میں واپس آگیا۔ آپ سے مِلا کہ شاید آپ انور بیگ کے جُرم کو بے نقاب کر کے اُسے اُس سزا تک پہنچائیں جس کا وہ مستحق تھا، لیکن

آپ کے رویے سے مایوس ہوگیا۔ اب میں کیا کرتا۔ قانونی طور پر اُس کو سزا دِلوا نہیں سکتا تھا۔ کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا۔ چناں چہ میں نے اُسے خود اُس کے اپنے ہاتھوں سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ میں صبح سویرے اس کے پاس گیا۔ اس کو بتا دیا کہ وہ راحیلہ کا قاتل ہے اور میں اسے اس جرم کی سزا دینے آیا ہوں۔ میں نے کہا اگر اس نے گڑبڑ کی تو میں اسے پستول سے مار ڈالوں گا وہ ڈر گیا۔ پھر میں نے لیمپ روشن کیا اور جب بلب گرم ہوگیا تو سفوف اس پر چھڑک کر کمرے سے باہر آگیا اور کھڑکی بند کر دی۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو میں اُسے گولی مار دوں گا۔ پانچ منٹ میں وہ مرگیا۔ بے شک جلال صاحب، یہ بڑی دردناک موت تھی اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ایسا کرنے پر آمادہ کیا تھا، لیکن ذرا سوچیے تو کیا راحیلہ اسی طرح تکلیف سے نہیں مری تھی اور اس کے دو نیک اور شریف بھائی، زندگی بھر کے لیے پاگل اور معذور نہیں ہو گئے؟ کیا میں نے انصاف نہیں کیا ہے؟"

میں اور جلال خاموشی سے ڈاکٹر مراد کی داستان سن رہے تھے۔ جب وہ چُپ ہوئے تو جلال نے پوچھا۔

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"میں افریقہ جا رہا ہوں اور اب یہاں کبھی نہ آؤں گا۔ میرے لیے اب کچھ نہیں رہا۔ میں اپنی زندگی انسانی بھلائی کے لیے تحقیق میں صرف کر دوں گا۔" ڈاکٹر مراد نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر مراد، جایئے انسانیت کی خدمت کیجیے۔ اس سانحے کو بھول جایئے۔ انصاف کا تقاضا پورا ہوگیا ہے۔"